جلد: 7
جمادی الاوّل ۱۴۳۳ھ

# ماہنامہ ماہِ نور دہلی

شمارہ: 11
اپریل ۲۰۱۲ء




## سرپرست

**حضرت مولانا مفتی سید شمس الضحیٰ مدظلہ**
سجادہ نشین دھاوا شریف غازی پور یوپی

**حسب فرمائش**
**Choksi Brothers & Sisters**
چوکسی برادرس اینڈ سسٹرس

**نوٹ:** رسالے کے مستقل قارئین اس جانب ضرور توجہ دیں کہ اگر ان کی ممبری فیس ختم ہوگئی ہو تو ادارہ کو جلد از جلد بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیں تاکہ ان کی ممبری بحال رہے۔



## مراسلت و ترسیل زر کا پتہ


ماہنامہ ماہِ نور
419، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی-110006

**MAAH-E-NOOR Monthly**
419, Urdu Bazar, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi - 110006

**E-mail:mahenoormonthly@gmail.com, Website : www.abulghaus.com**


| | | |
|---|---|---|
| قیمت فی شمارہ | : | 12روپے |
| قیمت سالانہ | : | 150روپے |
| بیرونِ ممالک | : | 20ڈالر |
| لائف ٹائم ممبر شپ | : | 5000روپے |
| // // بیرون ممالک | : | 300ڈالر |


Printer, Publisher & Owner
**SYED ABUL HASAN**

**Published at:**
2229, Star Offset Printing Press
Ahata Hajjan Bi, Rodgran, Delhi-6

**Published from:**
419, Urdu Bazar, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi - 110006

# فہرست مضامین



## خصوصی موضوع: حالیہ اسمبلی انتخابات اور الیکشن کمیشن

محمد ارشاد عالم نعمانی

# مجوزہ دہلی مدرسہ بورڈ
## کیامدارسِ اسلامیہ کے حق میں ہے؟

پچھلے ایک مہینہ قبل دہلی حکومت کی جانب سے اخبارات میں اعلان شائع ہوا کہ حکومت دہلی مدارس کوایک منظّم نظام سے مربوط کرنے اور مدرسہ کی جدید کاری کے پس منظر میں دہلی مدرسہ بورڈ کے قیام کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس خبر کے منظر عام پر آتے ہی اخبارات میں بیان بازی اور ہنگامہ آرائی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا اور حسب سابق دیگر ایشوز کی طرح یہ ایشو بھی سردخانے میں جاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

مدرسہ بورڈ کے قیام کے پس منظر میں دہلی حکومت کے کیا خفیہ مقاصد وعزائم ہیں اس پر گفتگو قبل از وقت ہوگی، لیکن حیرت کی بات ہے کہ ابھی 'مدرسہ بورڈ' قائم نہیں ہوا لیکن بعض اربابِ مدارس حکومت کی خفیہ پلاننگ سے قبل از وقت واقف ضرور ہو گئے اور انھیں اس کے پیچھے حکومت کی یہ سازش نظر آنے لگی کہ اس کے ذریعہ مدارس کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا ہے۔ یہ مدارس کی خودمختاریت پر حملہ ہے، حکومت کا یہ قدم اسلام دشمن طاقتوں کے زیر اثر ہے۔ حکومت مدارس کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہتی ہے۔ یہ کوشش مدارس کے نظام ونصابِ تعلیم میں مداخلت کے لیے کی جارہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، جس کا آئین عوامی مفادات کی حکومت کا علمبردار ہے اس لیے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بلاتعصب ہر طبقے اور ملت کے لوگوں کے مفاد میں کام کرے، سبھی شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مخلصانہ کوشش کرے۔ مسلمان جو کہ اس ملک کی ایک بڑی اقلیت ہے، اس کی تعمیر وترقی کے لیے نفع بخش عملی اقدامات بھی حکومت کی ترجیحی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومتیں مکمل طور سے مسلمانوں کے مفادات کی تکمیل میں مخلص نظر نہیں آتیں، جس کی وجہ سے مسلمان ترقی و روزگار کی دوڑ میں ابھی بھی بہت پیچھے ہیں۔ چنانچہ کچھ سال قبل سچر کمیٹی کی رپورٹ سے مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی وتجارتی صورتِ حال کی جو واقعی صورتِ حال سامنے آئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کے لیے صرف حکومت کو ہی ذمہ دار قرار دینا کسی بھی طرح انصاف پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ اس سلسلے میں خود مسلمان بھی بذاتِ خود ذمہ دار ہیں۔

مسلم قیادت کی یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ جب حکومت مسلمانوں کے تعلق سے کچھ نہیں کرتی تو مسلم قوم کی جانب سے عصبیت، بے توجہی اور ترجیحی سلوک کا رونا رویا جاتا ہے اور جب حکومت کچھ کرنا چاہتی ہے تو اس کے پیچھے سازش کا الزام لگا کر اس منصوبے کو موضوعِ بحث بنا کر رد کر دیا جاتا ہے۔

جہاں تک دہلی مدرسہ بورڈ کا سوال ہے اس سلسلے میں بھی حکومت کے غیر مخلصانہ رویہ کے ساتھ مدارس کے اربابِ حل وعقد اور مسلم دانشوران کا رویہ بھی صحیح نہیں۔ حکومت کا رویہ اس سلسلے میں اس لیے محل نظر ہے کہ اگر حکومت اس سلسلے میں ذرا بھی مخلص ہوتی تو وہ اسے بحث کا موضوع بنانے کے بجائے اربابِ مدارس سے نتیجہ خیز گفتگو کے بعد اس کے عملی اقدام کے لیے کوشش کرتی۔

جو حضرات اس بورڈ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں کیا ان کی نگاہوں سے یہ پوشیدہ ہے کہ ملک کی کل 31 ریاستوں میں سے 12 ریاستوں میں پہلے سے مدرسہ بورڈ موجود ہے اور جہاں کے مدارس مذکورہ ریاستوں کے مدرسہ بورڈوں سے ملحق ہیں اور بورڈ کے نصاب و نظامِ تعلیم کے لحاظ سے وہ ادارے چل رہے ہیں اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں، تو کیا ان ملحقہ مدارس میں مدارس کا اصل نصاب و نظامِ تعلیم متاثر ہے؟ کیا حکومت ان اداروں کی مذہبی تعلیم کے فروغ میں مداخلت کر رہی ہے؟ یا اسلام دشمن سازشوں کے جال میں پھنس کر وہاں کے اخلاقی اور تربیتی نظام کو تہہ و بالا کر رہی ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ ملحقہ مدارس کی کارکردگی دیگر نجی ادارے کی کارکردگی سے کہیں بہتر ہے۔ بورڈ کے مالی فنڈ سے متعلق ہونے کے بعد اکثر منظور شدہ مدارس ضرور متاثر ہوئے ہیں لیکن حکومتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اربابِ مدارس کی بدنیتی اور حق داروں کے حق مارنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ چند مدارس اس سلسلے میں ایسی مثال ہیں جو منظوری کے باوجود قطعاً متاثر نہیں ہیں بلکہ وہاں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ مدرسہ سرکاری ہے یا پرائیویٹ۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ مدارس کے نصاب ونظامِ تعلیم اور معیارِ تعلیم کے تناظر میں اگر ہندوستان کی دیگر ریاستوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح نظر آتی ہے کہ جن اداروں یا مدارس میں قطع نظر کہ وہ سرکاری ادارے ہوں یا

پرائیویٹ، مخلص و جفاکش افراد کام کررہے ہیں وہاں کا نصاب و نظام تعلیم اور معیارِ تعلیم اطمینان بخش ہے جب کہ وہ ادارے جو ایسے باصلاحیت، مخلص، ایماندار اور محنتی افراد سے خالی ہیں وہاں کی تعلیمی صورتِ حال اطمینان بخش نہیں سرکاری ہو کہ غیر سرکاری۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے منظور شدہ اداروں کی تعلیم انحطاط پذیر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں اساتذہ کا انتخاب صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ادارہ کے منتظم اعلیٰ کی قرابت داری اور ادارے کی مدد کے نام پر موٹی موٹی رقم کی رشوت کا دخل ہوتا ہے۔ تو یہ تو مدارس کی انتظامیہ کی داخلی کمزوری ہے نہ کہ ادارہ کے ملحق ہوجانے کی وجہ سے۔

مخالفین مدرسہ بورڈ کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ ادارہ جب بورڈ سے منظور ہوگا تو اساتذہ خود سر ہوجائیں گے، اور پھر ادارہ کا تعلیمی نظام متاثر ہوگا۔ یہ خیال بھی غلط مشاہدے پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں بھی اخلاص یا عدم اخلاص کا معاملہ ہے۔ جن اداروں میں اساتذہ مخلص ہیں، خدمت دین کا صالح جذبہ رکھتے ہیں، ملک وقوم اور سماج کی مثبت تعمیر وترقی کے جوشِ عمل سے معمور ہیں وہ سرکاری اداروں میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر متواضع زندگی اور مخلصانہ جہد وعمل سے ہمہ دَم و ہمہ قدم سرشار ہوتے ہیں اور پورے اخلاص وللّٰہیت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ساتھ ہی مدرسہ بورڈ کے قیام کے کثیر رُخی فوائد کو بھی ایسے حالات میں پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ موہوم امیدوں اور ممکنہ خطرات کی بنیاد پر یقینی فوائد سے انحراف اور روگردانی دانشمندی کی بات نہیں۔

دہلی مدرسہ بورڈ کے قیام کا سب سے اہم فائدہ مدارس کے لیے یہ ہے کہ دیگر صوبہ کے ملحق مدارس کی طرح یہاں کے مدارس بھی ایک منظّم و مربوط نظام کے تحت آجائیں گے۔ دوسرا سب سے اہم فائدہ یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ مدارس کی اسناد سی بی ایس سی کے مساوی ہوجائیں گی اور جس طرح دیگر اسکولوں کے طلبہ مین اسٹریم سے جڑے ہوئے ہیں مدارس کے طلبہ بھی مین اسٹریم سے جڑ جائیں گے اور انھیں بھی ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور ان کے لیے بھی وہ سارے راستے کھلے ہوں گے جو اسکول کے طلبہ کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ مثلاً اعلیٰ تعلیمی مواقع کے حصول کے ساتھ سول سروس میں کامیابی، یوں ہی ان کے لیے اعلیٰ روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوسکتے ہیں۔

یہاں اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب مدارس میں جدید علوم کی شمولیت ہوگی تو اس سے یقینی طور پر دینی تعلیم پر اثر پڑے گا اور مدارس کے مطلوبہ نتائج سامنے نہیں آئیں گے۔ اس سلسلے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ بلاشبہ مدرسہ کی تعلیم دین کے استحکام اور قرآن وحدیث کے فہم کے لیے ہے لیکن یہ کون سی عقل مندی کی بات ہوگی کہ اپنی خود ساختہ تفریق تعلیم کی وجہ سے ان علوم کو بھی شامل نصاب کیے جانے میں بے جا خدشات کا اظہار کیا جائے۔ جو قرآن وحدیث اور دین کے فہم میں معاون ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ علوم کی درجہ بندی دینی تعلیم اور عصری تعلیم میں کیا جانا غلط ہے کہ اسلام میں ایسی کوئی تقسیم ہے ہی نہیں، ہاں! یہ ہے کہ کون سا علم نفع بخش ہے اور کون سا غیر مفید اس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اب اگر مدارس کے نصاب میں کمپیوٹر، ریاضی، سائنس اور انگریزی کی تعلیم کی شمولیت کے لیے زور دیا جارہا ہے تو اس میں حرج کیا ہے؟ آج مدارس کا اگر جائزہ لیا جائے تو کسی نہ کسی حیثیت سے ان علوم کو شامل نصاب رکھا گیا ہے۔ اب اگر یہی بات حکومت کی جانب سے کہی جاتی ہے تو اسے مذہبی تعلیم میں مداخلت کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ ہاں! البتہ علوم کس مقدار میں مدارس کے نصاب میں شمولیت کی گنجائش رکھتے ہیں یہ ارباب مدارس کے طے کرنے کا معاملہ ہے جسے حکومت کو بھی فراخدلی کے ساتھ اربابِ مدارس کے اختیار میں دینا چاہیے۔ کیونکہ مدارس کا نصاب یہ حکومت یا اربابِ مدارس کے علاوہ دیگر کسی فرد کو طے کرنے کی چیز ہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں مکمل اختیارات اہل مدارس کو حاصل ہونا چاہیے۔ ان سبھی بے تکی باتوں میں مصروف ہونے کے بجائے ہمیں سوچنا چاہیے اور آواز اُٹھانی چاہیے کہ آخر سنسکرت کے پاٹھ شالاؤں میں کن عصری علوم وفنون کو داخل نصاب کیا گیا ہے؟ اور سچائی یہ ہے کہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے تو پھر مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں عصری علوم کی شمولیت کی بات اُٹھائی، اس کے باوجود سنسکرت پاٹھ شالاؤں کی اسناد حکومت تسلیم کرتی ہے تو صرف ایک زبان کی سند جب قابل تسلیم ہوسکتی ہے تو پھر مدارس کے نصاب میں شامل دس سے زائد علوم اور تین زبانوں پر مشتمل سند کیوں قابل تسلیم نہیں ہوگی۔

دہلی مدرسہ بورڈ کے حوالے سے یہ پہلو انتہائی افسوسناک ہے کہ جو حضرات اس کی مدافعت میں اخباری بیانات دیتے ہوئے نظر آئے وہ صرف

زبانی جمع خرچ کی حد تک ہی نظر آیا، تحریری طور پر ان کی جانب سے کوئی لائحۂ عمل اور منصوبہ بندی دیکھنے کو نہ ملی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مدرسہ بورڈ کی تشکیل کیسے ہونی چاہیے؟ اس کے لیے کون سا لائحۂ عمل اپنایا جانا چاہیے؟ مدرسہ بورڈ کی تشکیل کے تعلق سے کن مسائل پر اربابِ مدارس حکومت سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟ ان سب سے ہٹ کر محض زبانی بیان بازی سے آگے کوئی چیز سامنے نہیں آسکی۔

اسی طرح جو حضرات مدرسہ بورڈ کی مخالفت سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ان کے پاس بھی کوئی ٹھوس اور مضبوط دلائل وشواہد نہیں دِکھے۔ محض امید موہوم اور خفیہ سازش کا دور دورہ ہی نظر آیا۔

ایسے حساس اوقات میں مسلم قیادت کی جانب سے مخصوص لائحۂ عمل نہ ہونا اپنے آپ میں لمحۂ فکریہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ایسے مواقع پر اگر حکومت کے دل میں کوئی کھوٹ بھی ہو یا سبز باغ کا تماشہ ہو تو مسلم قیادت ایسے تدبر وبصیرت کا مظاہرہ کرے کہ حکومت نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ نہ یہ کہ آپسی اختلافات کو سامنے لاکر مسلم مفادات کے تحفظ کو نقصان پہنچایا جائے۔

اخیر میں اس تلخ حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس سے قبل 'مرکزی مدرسہ بورڈ' کا حشر بھی آپسی اختلافات کی نذر ہو کر سرد خانے میں پڑا ہوا ہے اور اب ایسا لگتا ہے کہ دہلی مدرسہ بورڈ بھی اسی کی نذر ہو کر نہ رہ جائے۔ مدارس کی تعمیر وترقی اور مسلمانوں کی تعلیمی حالت سدھارنے کے لیے جب بورڈ کے قیام کی تجویز پیش کی جاتی ہے تو وہ صرف اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہوتی ہے کہ اس میں ایک مخصوص مسلک کو اس بورڈ پر بالا دستی کا موقع نہیں مل پاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اس کی مخالفت میں اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگانے سے نہیں تھکتے۔ اس سلسلے میں حکومت بھی کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کی ترقی کو لے کر مخلص اور سنجیدہ نہیں ہے۔ ورنہ بلاوجہ مخالفت کو وہ کیوں سنتی ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی مسلم اکثریت کی حمایت کے باوجود اس کے قیام کے راستے کو کیوں نہیں ہموار کرتی۔ اس سے واضح طور سے سامنے آتا ہے کہ حکومت کے دل میں کہیں نہ کہیں کھوٹ ضرور ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ جو طبقہ بورڈ کی مدافعت میں ہے اسے ساتھ لے کر بورڈ کے قیام کو یقینی بنائے۔ اگر حکومت ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو کوئی بعید نہیں کہ وہ حضرات بھی خود بخود اس میں شامل ہو جائیں گے جو آج اس کی مالفت کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

حامیانِ مجوزہ مدرسہ بورڈ کے لیے اب کرنے کے کیا کام ہیں جس کے ذریعہ حکومت دہلی کو باور کرایا جاسکے کہ واقعی یہاں مدرسہ بورڈ کی ضرورت ہے اور اس سے مدارس دہلی کے روشن مستقبل کا مفاد وابستہ ہے۔ یہ بورڈ منظور نہیں ہوتا ہے تو اس کے واقعی اثرات حکومت پر مرتب ہوں گے لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ چاہیے کہ:

(1) بورڈ کی منظوری کے سلسلے میں زبانی جمع خرچ اور اخباری بیان بازی کے بجائے عملی اقدام کریں۔

(2) مدارس کی شرعی، سماجی حیثیت اور تاریخی تعلیمی مقام پر مشتمل ایک تعارف تیار کیا جائے۔

(3) جس میں دہلی کے مدارس ومکاتب کی تعلیمی صورتِ حال اور نظامِ تعلیم کا تعارف بھی شامل ہو۔

(4) سرکاری اسناد کی مناسبت سے مولویت، عالمیت اور فضیلت کی صراحت کے ساتھ سبھی مدارس دہلی کے نصابِ تعلیم اور مدارس کی درجہ بندی کی فہرست تیار کی جائے۔

(5) مدارس کے نصاب میں حساب، جغرافیہ، کمپیوٹر بطور مستقل مضمون اور ہندی، انگریزی بطور زبان کی تعلیم شامل ہے اس لیے الگ سے اس کی شمولیت کے بارے میں بتایا جائے کہ اس تعلق سے گفتگو غیر ضروری ہے۔

(6) یہ بھی باور کرایا جائے کہ جس مطلوبہ معیار مدارس کے اندر پہلے سے موجود ہیں تو پھر اس غیر ضروری بحث میں الجھا کر حکومت مسلمانوں سے کیسے کیسے وعدے کو پورا کرنے میں پہلو تہی سے کام نہ لے اور اس تعلق سے اپنے عزائم واقدام کو واضح کرے۔

اگر ان خطوط پر حامیانِ مدرسہ بورڈ کی جانب سے عملی اقدام کیے جائیں تو کوئی بعید نہیں کہ ہمیں اپنے مطالبہ میں کامیابی نہ ملے۔

خلاصہ یہ کہ مدرسہ بورڈ کے حامیین اور مخالفین کے دلائل کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ طے ہے کہ مدرسہ بورڈ بننے سے مدرسوں کی سند کا معیار بلند ہوگا اور اس سے فارغ طلبہ کالج اور یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینے کے ساتھ ساتھ روزگار سے بھی جڑ پائیں گے۔

ای میل: mirshadnomani@gmail.com، موبائل: +919555584637

# منظومات

## نعت شریف

آپ سے بڑھ کے دنیا میں کوئی نہیں
سَیّدُالمُرسَلِیں سَیّدُالمُرسَلِیں

آپ کہف الوریٰ آپ نورالہدیٰ
آپ بدرالدجیٰ آپ شمس الضحیٰ
ثانی ہو کوئی دنیا میں کیا آپ کا
آپ ہیں اوّلیں آپ ہیں آخریں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

آپ کے نور سے پوری دنیا بنی
آپ کے دم قدم سے ملی روشنی
ہر طرف کو یہ کو کیوں نہ ہو تازگی
آپ یٰسین و طٰہٰ ہیں نورِ مبیں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

آپ آئے تو ہریالیاں آگئیں
آپ آئے تو خوشحالیاں آگئیں
سوکھے دھانوں میں بھی بالیاں آگئیں
ہوگئی رشکِ جنت یہ بنجر زمیں
سید المرسلیں سید المرسلیں

لائے تشریف جگ میں حبیبِ خدا
خاک سونا بنی ذرّہ تارا ہوا
مرحبا مرحبا مرحبا مرحبا
ہوگئی آسماں سے بھی اونچی زمیں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

اِک اشارے پہ انگلی کے شق ہو قمر
حکم کے منتظر کیا شجر کیا حجر
زلف سے شام ہو اور رُخ سے سحر
عرش تا فرش ہر شے ہے زیرِ نگیں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

پاسکے کیا کوئی مرتبہ آپ کا
آپ کی مدح قرآں میں رب نے کیا
اِنس و جاں اور ملک آپ پر سب فدا
آپ کے در کا خادم ہے روح الامیں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

ہیں غریبوں کے یاور حبیبِ خدا
بے سہاروں کے سرور حبیبِ خدا
نور کا ایک پیکر حبیبِ خدا
اور یہی ذات ہے رحمت العالمیں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

کون آیا ہے مکہ میں پچھلے پہر
رات بھر جگمگاتا رہا سارا گھر
اور مچلتی تھی کہہ کے نسیم سحر
آگئے رونق بزم عرشِ بریں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

آپ کی مثل دنیا میں آیا نہیں
آپ کے جیسا رب نے بنایا نہیں
از زمیں تا فلک کوئی پایا نہیں
اے فریدؔی یہ کہتے ہیں روح الامیں
سَیّدُ المُرسَلِیں سَیّدُ المُرسَلِیں

**منصور فریدی**
رائے پور، چھتیس گڑھ

## نعت شریف

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
مجھ کو لگا یہ ایسا دریا کسی نے مانگا

کتنے سخی ہیں آقا معلوم کیا کسی کو
اس سے سوا دیے ہیں جتنا کسی نے مانگا

بیشک وہ ہوگیا ہے دونوں جہاں میں روشن
جب بھی درِ نبی کا ذرّہ کسی نے مانگا

ہے شان اپنی اپنی ہے اپنا اپنا رتبہ
دُنیا کسی نے مانگی عقبیٰ کسی نے مانگا

اصحاب نے جو دیکھا دستِ عطا نے مولیٰ
جھولی بھری کسی نے رتبہ کسی نے مانگا

صدقی سے عمر سے عثمان سے علی سے
ویسا اسے ملا ہے جیسا کسی نے مانگا

آلِ حسن کا پایا آلِ حسین کا بھی
گر آلِ مصطفیٰ کا صدقہ کسی نے مانگا

جو کچھ بھی چاہتے ہیں سب کچھ تو مانگتے ہیں
رضواؔں انھیں نہ مانگا پھر کیا کسی نے مانگا

**رضوان الرضا رضواؔن**
طبیہ کالج، کٹولی، ملیح آباد، لکھنؤ، یوپی

ذکی الرحمٰن غازی ☆

# رشتۂ زوجین پر قرآنی تشبیہ کا مطالعہ

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب قرآنِ کریم میں تقریبِ فہم اور توضیحِ مراد کی خاطر مختلف اشیا واعمال کو تشبیہ وتمثیل کے اسلوب میں بیان فرمایا گیا ہے۔اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عام انسان کو آسانی سے بات سمجھ میں آجاتی ہے اور ایک صاحبِ علم کے غور وفکر کے لیے معانی وحکمتوں کی پوری دنیا منکشف ہو جاتی ہے۔اس سیاق میں اگر انسانیت کی دونوں صنفوں ’مرد اور عورت‘ کے مابین قائم ہونے والے تعلقِ ازدواج کی قرآنی بنیادوں کو جاننے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اس رشتے کی نوعیت کو لباس سے تشبیہ دی ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرۃ:187)

’’وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔‘‘

بظاہر لباس کا مطلب وہ کپڑا ہے جو انسان اپنے جسم پر پہنتا ہے۔لیکن کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زوجین کے تعلقات کو لباس اور صاحبِ لباس کے تعلق کی مثال سے واضح کیا ہے؟ صورتِ مسئلہ کی تمام ابعاد واطراف کا علم تو ربِ کائنات ہی کو ہوگا،لیکن غور وفکر سے بھی ان دونوں رشتوں کی باہمی یگانگت ومماثلت سمجھ میں آتی ہے۔اس مختصر مضمون میں لباسِ انسانی کے اہم مقاصد،صفات وخصوصیات اور اس کے ساتھ برتے جانے والے طریقہ ہائے تعامل کی روشنی میں زوجین کے تعلقات کی قرآنی تشبیہ کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔وباللہ التوفیق۔

**چند اصولی باتیں:**

سب سے پہلے چند اصولی باتیں سمجھنے کی ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ لباس ایسی انسانی ضرورت ہے جس سے کسی بشر کو استغنا نہیں ہوسکتا۔مادر زاد برہنگی جس طرح ماضی میں سلیم الفطرت انسان کے لیے عیب تھی ویسے ہی مادّیت پرستی واباحیت زدگی کے اس زمانے میں بھی انسانی ضمیر وفطرت مکمل برہنگی سے گھن کھاتے ہیں۔اس قرآنی تشبیہ سے ایک اصولی بات یہ سمجھ آتی ہے کہ قرآنی تصورِ زندگی میں شادی ونکاح،اسی درجہ ناگزیر وضروری انسانی حاجت قرار پاتے ہیں جس طرح کہ لباس۔اس بابت ہمارے لیے اسوہ حسنہ کسی بزرگ یا ولی کا طرزِ عمل نہیں، بلکہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی سنت وعمل ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ پیدائش کے بعد بچوں کی برہنگی کو ایک معینہ عرصہ تک قابلِ انگیز مانا جاتا ہے۔لیکن ایک مناسب مدتِ عمر کے بعد بچوں کو ستر پوشی کی تلقین نہ کرنا اور برہنگی سے نہ روکنا،انھیں عریانیت وبے حیائی کی تعلیم دینے کے مرادف ہوجاتا ہے۔بالکل اسی انداز میں مناسب عمر کو پہنچنے کے بعد، جو شریعت میں قرائن وعلامات اور سن وسال سے معین ومحدد کی گئی ہے، نوجوان لڑکے لڑکیوں کی شادی ونکاح پر توجہ نہ دینا بھی اباحیت وفواحش کے رواج پانے کا سبب بنتا ہے۔موجودہ زمانے کی صورت حال سے زیادہ بہتر اس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔دیکھنے والی آنکھ آج فحاشی وبے حیائی کے جن مظاہر کا مشاہدہ کررہی ہے، ان کے برپا ہونے میں ایک بڑا سبب شادی ونکاح کے معاملہ میں اس اسلامی مزاج سے انحراف کرنا بھی ہے۔

تیسری اور اہم ترین بات یہ کہ لباس کی خرید وفروخت یا تیاری وفراہمی کا مسئلہ عام انسانی زندگی میں ایسا نہیں سمجھا جاتا کہ سالہا سال پہلے سے اس کے لیے تیاری ہو اور لاتعداد دولت اکٹھی کی جائے۔بالکل اسی لحاظ سے نکاح اور شادی کا معاملہ بھی اسلامی معاشرہ میں ایسا مہتم بالشان مسئلہ نہیں ہوتا جس کے لیے لمبی چوڑی تقریبات اور فضول خرچیوں کا التزام کرنا فرض خیال کیا جائے۔فرحت ومسرت کے موقع پر خوشی منانا انسانی فطرت ہے اور شرعی طور سے اس میں قباحت بھی نہیں،لیکن اس خوشی کے موقع پر بے شمار غیر عقلی وغیر شرعی رسوم ورواج اور اعراف وتقالید کا اہتمام کرنا،اور اس کے نتیجے میں ایک سیدھے سادے مسرت آمیز موقع کو باعثِ تکلیف وباعثِ غم بنادینا عقلاً اور شرعاً حرام وقابلِ نفریں ہے۔

**لباس کے مقاصد واہداف**

انسان بہ مقتضائے فطرتِ سلیمہ اپنی ستر پوشی کا اہتمام کرتا ہے۔اس میں مد نظر یہ بھی رہتا ہے کہ مختلف موسمی تغیرات وماحولیاتی انقلابات مثلاً حرارت وبرودت وغیرہ سے،زخمی کرنے اور اذیت پہنچانے والی اشیاء سے اور مختلف فضائی آلودگیوں اور جراثیم سے جسمِ انسانی کی حفاظت وصیانت ہوجائے اور وہ مختلف امراض وآفات سے محفوظ رہ سکے۔شادی کرنے میں بھی انسان اپنی نوع ونسل کو مٹنے اور منقطع ہونے سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔انسانی فطرت میں یہ داعیہ ودیعت ہے کہ وہ اپنے ڈی این اے کو اولاد واحفاد اور نسل وذریت کی شکل میں بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتا ہے۔اس جذبہ کی درست عکاسی خود خالقِ فطرت کے کلام میں پائی جاتی ہے:

وَاللّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ۔(نحل،72)

’’اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور

☆ اسلامی یونی ورسٹی، مدینہ منورہ

اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں، پھر کیا یہ لوگ (سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں۔''

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ہمیں شادی کرنے کا حکم فرماتے اور تبتل وانقطاع کرنے سے سختی سے روکتے تھے، اور فرماتے تھے: ''ایسی عورتوں سے شادی کرو جو محبت کرنے والی اور خوب جننے والی ہوں کیونکہ میں روزِ قیامت تمہاری وجہ سے دیگر انبیا پر (امت کی) کثرت میں بڑھنا چاہتا ہوں۔'' (مسند احمد: ۱۲۶۳۴۔ صحیح ابن حبان: 4028)

شادی میں حفاظتِ نفس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے آپ کو ایسے معاصی وفحش اعمال سے محفوظ کر لیتا ہے جو دنیا میں مہلک امراض اور آخرت میں عذابِ عظیم کا موجب بنتے ہیں۔ قریبی دور میں سامنے آیا 'ایڈز' نامی لاعلاج مہلک مرض بھی جنسی بے راہ روی کی پیداوار مانا گیا ہے اور اس سے بچنے کا واحد راستہ شرمگاہوں کی حفاظت بتایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے شرمگاہوں کی حفاظت کا ایک طریقہ نگاہیں نیچی رکھنا بیان کیا ہے:

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ. وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ. (نور: 31-30)

''اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے باخبر رہتا ہے۔ اور اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔''

آیتِ کریمہ میں شرم گاہوں کی حفاظت وعفت کے لیے غضِ بصر کو ایک وسیلہ بتایا گیا ہے، لیکن فرمانِ رسالت میں شادی کر لینے کو، نگاہوں کے نیچے رکھنے اور شرم گاہوں کے محفوظ و پاکیزہ رکھنے کا کارگر و مؤثر ترین نسخہ قرار دیا گیا ہے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

''اے گروہِ نوجوانان! تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے شادی کر لینی چاہیے کیونکہ شادی کی وجہ سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ البتہ جو شادی کی استطاعت نہیں رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ روزوں کا التزام کرے کیونکہ روزہ شہوتِ نکاح کو کاٹ دیتا ہے۔''

يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فانّه أغضّ للبصر وأحصن للفرج، ومن لم يستطع فعليه بالصوم فانّه له وجاء۔ (صحیح بخاری: 5065۔ صحیح مسلم: 3464)

**ستر پوشی وپردہ داری**

لباس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے اپنے قابلِ حیا جسمانی حصوں کو لوگوں سے چھپانا چاہتا ہے۔ ستر پوشی کا یہ اہتمام اس لیے ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کے وجدان وفطرت میں حیا وشرم کا مادہ رکھا ہے، اور یہ اس کے اشرف المخلوقات یا تکریم واعزاز یافتہ مخلوق ہونے کا تقاضا بھی ہے۔ اس میں ایک ضمنی مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے بعض جسمانی وخلقی عیوب اور غیر طبعی امور کو مخفی رکھنا چاہتا ہے جن کے بارے میں اسے قطعی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی محرم یا قریب ترین رشتہ دار بھی ان پر مطلع ہو جائے۔ شادی یا ازدواجی زندگی میں زوجین کا ایک دوسرے کے لیے یہی کردار ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے لباس اور پردہ بن جاتا ہے۔ قرآن جب زوجین کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیتا ہے تو اس سے مراد یہی ستر پوشی واخفا کا عمل ہے۔ اس استنباط کی مزید تائید وتوثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت نے رات کو بھی لباس قرار دیا ہے، کیونکہ رات اپنی تاریکی میں اشیا واشخاص سبھی کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاساً وَالنَّوْمَ سُبَاتاً وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوراً. (فرقان: 47)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے لباس، اور نیند کو سکونِ موت اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا۔''

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً. (نبأ: 10) ''اور رات کو پردہ پوش بنایا۔''

سابقہ آیات کے تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کے نزدیک جو تعلق رات کا دنیائے انسانیت کے ساتھ ہوتا ہے، بعینہ وہی رابطہ یا تعلق زوجین کا آپس میں ہوتا ہے۔ ایک طرف قرآن کریم لباس کے لفظ کو رات کے پس منظر میں چھپانے اور ڈھانپ لینے کے معنی میں استعمال کرتا ہے، تو دوسری طرف لباس ہی کے لفظ کو انسانی عورات کی پردہ پوشی کے لیے بھی استعمال کرتا ہے:

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِي سَوْءَاتِكُمْ وَرِيشاً وَلِبَاسُ التَّقْوَىَ ذَلِكَ خَيْر. (اعراف: 26)

''اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقوی کا لباس ہے۔'' شاید زوجین کے مابین اسی رشتۂ ستر پوشی واخفائے عیوب کا لحاظ کرتے ہوئے شریعت نے بہت سختی سے اس بابت نکیر فرمائی ہے کہ زوجین میں سے کوئی اپنے شریکِ زندگی کے جسمانی اوصاف دوسروں کو بیان کرتا پھرے۔

**زینت وآرایش:**

زینت کے لغوی معنی میں ہر وہ چیز شامل ہے جس سے خوبصورتی حاصل کی

جاتی ہے۔درحقیقت اس کے اطلاق میں وہ تمام اشیا داخل ہیں جو انسان کو کسی طور سے بھی بھونڈا، یا بدشکل نہ بناتی ہوں۔ ہر انسان پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس دیدہ زیب ہو، باعثِ شرم وعار نہ ہو۔ آرائش وزیبائش کو پسند کرنا بشری جبلت ہے جس میں فی نفسہٖ کوئی حرج کی بات نہیں۔ارشادِ باری ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. (اعراف:32)

''اے محمد!ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟''

حضرت ابن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا: جنت میں نہیں داخل ہوگا ایسا شخص جس کے دل میں ذرہ بھر کبر ہے۔ایک آدمی نے یہ سن کر کہا: کوئی انسان پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اور اس کا جوتا خوبصورت نظر آئے؟ آپ نے فرمایا: اللہ رب العزت جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے، کبر تو یہ ہے کہ حق کو جان کر نہ مانا جائے اور لوگوں کی حق تلفی کی جائے۔''

یہ سب فرمودات لباسِ انسانی سے متعلق ہیں۔

زوجین کے تعلق سے دیکھیں تو مرد وعورت دونوں پسند کرتے ہیں کہ ان کا شریکِ زندگی ان کے لیے باعثِ زینت وجمال ہو، نہ کہ سببِ شرم وعار۔لیکن یہ زینت وجمال کس سطح کا ہو، اس بارے میں انسانی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔کچھ لوگ اس کو جسمانی حسن پر موقوف سمجھتے ہیں، کچھ لوگ مال وثروت پر، کچھ لوگ جاہ وعزت پر اور کچھ لوگ دینداری وتقوی پر۔ارشادِ نبوی ہے: عورت کو چار وجوہات سے نکاح میں لیا جاتا ہے: مال کے سبب، خاندانی عزت کے سبب، خوبصورتی کے سبب اور دینداری کے سبب۔تم دیندار خاتون کو عقدِ نکاح میں لے کر کامیاب ہو جاؤ، اللہ تمہارے ہاتھ خاک آلود رکھے!''(صحیح بخاری:5090۔صحیح مسلم:3708)

واضح رہے کہ حدیث میں عورت کے نکاح کا تذکرہ عادت وعرف کا لحاظ کرتے ہوئے آیا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک اچھے شوہر کے انتخاب میں بھی اس حدیث کو مشعلِ راہ نہ بنایا جائے۔حدیث میں مذکور چاروں چیزیں مال، عزت، حسن اور دین اپنی اپنی قسم کے تمام اجزا واشکال پر محیط ہیں۔جس طرح مال کے مفہوم میں دولت وثروت کی تمام شکلیں شامل سمجھی جاتی ہیں، اسی طرح عزت وجاہ کے عموم میں تعلیمی لیاقت اور علمی ڈگریوں کو بھی داخل مانا جائے گا۔ سابقہ آیات واحادیث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح کسی خوش رو انسان کی خوش لباسی اس کے حسن وکشش میں اضافہ کرتی ہے، بالکل اسی طرح زوجین میں سے ہر ایک، دوسرے کی زینت وجمال میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اور اسے بننا چاہیے۔

## مشکلاتِ زندگی میں مدد ومعاونت

ہر انسان اپنے لیے وہ لباس اختیار کرتا ہے جو اس کی مخصوص تجارت وعمل میں مدد ومعاون ہو، حارج نہ ہو۔کچھ لوگ اپنے کام اور پیشہ کے مدِ نظر تنگ اور چست لباس پہنتے ہیں جبکہ کچھ لوگ اپنی تجارت وحرفت ہی کی وجہ سے ڈھیلا ڈھالا لباس اختیار کرتے ہیں۔یہ ایک معلوم ومجرب حقیقتِ واقعہ ہے جس کو بآسانی اپنے آپ پر غور کر کے جانا جا سکتا ہے۔لباس کے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر مختلف سرکاری محکموں وحکومتی شعبوں کی وردیوں اور پوشاکوں کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔

شادی میں شریکِ حیات کے انتخاب میں بھی انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کو ایسا ساتھی ملے جو امورِ زندگانی میں بہترین معاون ومددگار ثابت ہو سکے۔چنانچہ بسا اوقات ترجیح کا پیمانہ جائیداد وبینک بیلنس ٹھہرتا ہے، اور کبھی اونچی نوکری اور موٹی تنخواہ۔کچھ لوگوں کی نظر امورِ خانہ داری میں مہارت پر ہوتی ہے جبکہ دیگر کچھ حضرات اپنے ہم پیشہ تعلیم یافتہ ساتھی کا جوڑا پسند کرتے ہیں۔جس طرح لباس کے انتخاب میں پیشِ نظر یہ ہوتا ہے کہ امور ومعاملاتِ زندگی میں کارآمد ومفید ثابت ہو، اسی طرح انسان کو شریکِ حیات کے انتخاب میں بھی اس پہلو کی رعایت رکھنے کا حق ہے، بشرطیکہ شرعی ضوابط وحدود میں رہتے ہوئے ایسا کیا جائے۔ارشادِ باری ہے:

وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (مائدہ:2)

''جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔''

## لباس کے اوصاف:

انسان اپنے لباس کے لیے ایسا کپڑا اور سلائی کا ایسا انداز اختیار کرتا ہے جو اس کے مقصود کو پورا کرے اور ساتھ ہی اس کی قامت پر جچ سکے۔لباس کا بیحد لمبا یا چھوٹا ہونا، بیحد تنگ یا ڈھیلا ہونا اس کو بے ہنگم ومعیوب بنا دیتا ہے۔لہٰذا لباس کا جسمِ انسانی کے موافق ومناسب ہونا حد درجہ ضروری ہے۔بالکل اسی انداز میں مرد وعورت میں سے ہر ایک کو اپنے رفیقِ حیات کے انتخاب میں مناسبت وموافقت کے اس پہلو کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔انسان بیشتر اوقات حرص وہوس میں اندھا ہو کر اپنی ذاتی مناسبت کو فراموش کر جاتا ہے اور ہر جگہ اپنی استطاعت ومناسبت سے کہیں زیادہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔دیگر امور ومعاملات میں بھی یہ حریصانہ رویہ نقصان دہ ہوتا ہے، لیکن رفیقِ زندگی کے انتخاب میں اس کی مضرت متعدی و کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔حسن وجمال، دولت وغنا، عزت وجاہ اور علم وفضل میں زوجین کی باہمی عدمِ مناسبت وعدمِ موافقت بالآخر سنگین نتائج کا

باعث بن جاتی ہے، جس کے مضر اثرات کئی خاندانوں اور نسلوں تک کو اپنی گرداب میں لے لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دانش مندانہ رویہ یہی ہے کہ شریکِ سفرِ حیات کے اختیار میں پوری سچائی و دیانت داری اور کامل واقعیت پسندی وعملیت کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس قرآنی تشبیہ کا ایک پیغام یہ بھی ہے۔

**نوع و اصل:**

لباس کے لئے لوگ اپنی اپنی طبیعت، علم یا دینداری کے مطابق مختلف الاصل ومختلف النوع (مثلاً اونی، سوتی، ریشمی وغیرہ) کپڑوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش بسیار کرتا ہے جو کہ درست بھی ہے۔ شادی کے لیے بھی انسان اسی طرح تلاشِ بسیار کرتا ہے اور اہلِ علم واہلِ تجربہ سے افضل ترین رشتہ کے بارے میں صلاح ومشورہ کرتا ہے۔ ایک آدمی نے نواسۂ رسول حضرت حسین بن علی سے دریافت کیا: میری ایک بیٹی ہے، میں اس کی شادی کس سے کروں؟ آپ نے جواباً فرمایا: جو اللہ سے ڈرنے والا ہو اس سے شادی کر دو، کہ اگر وہ تمہاری بیٹی سے محبت کرے گا تو اکرام واعزاز میں رکھے گا اور نفرت کرے گا تو خدا کا خوف اسے ظلم نہیں کرنے دے گا۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ:12871)

اس سلسلے میں قرآن کریم سب سے زیادہ مکرم وشریف شخص اس کو قرار دیتا ہے جو زیادہ سے زیادہ اپنے رب سے ڈرنے والا ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ. (حجرات:13)

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

نکاح میں دینداری کو معیار قرار دینے والی حدیث کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔

**شکل وصورت اور رنگ:**

انسان مختلف نفسیاتی وفطری داعیات کے سبب متنوع اشکال والوان کا لباس اختیار کرتا ہے۔ مطمحِ نظر اس میں یہ ہوتا ہے کہ خود انسان کے دل ودماغ اس پسند سے راضی ہو جائیں اور معاشرے میں بھی اس کو مذاق وتفریح کا موضوع نہ بنایا جائے۔ ماہرینِ نفسیات بھی انسان کے لباس کو اس کی داخلی شخصیت کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم الفطرت ونفسیاتی لحاظ سے صحت مند انسان بھڑکیلے رنگوں کے لباس سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں ایسے لباسوں سے بھی اجتناب وگریز کیا جاتا ہے جو فردِ مخصوص کی شکل وصورت سے، یا عمر وررتبہ سے میل نہیں کھاتے، یا اس کے خاندانی پس منظر یا سماجی مقام (سوشل اسٹیٹس) کے منافی ہیں۔

ازدواجی زندگی میں ہر انسان ایسا ساتھی چاہتا ہے جو اس کے مناسب ہو اور اس سے میل کھاتا ہو؛ بصورتِ دیگر وہ لوگوں کی چبھتی نگاہوں کا مرکز بنتا ہے اور اس کی ملامت وتنقید میں زبانیں چلنے لگتی ہیں۔ غالبًا یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بڑی تاکید فرماتے تھے کہ شادی سے قبل زوجین میں سے ہر ایک اپنے مجوزہ شریکِ زندگی کو دیکھ لے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے: جب تم میں سے کوئی پیغامِ نکاح بھیجے، تب ممکن ہو کہ نکاح جس خاطر کیا جارہا ہے اس پر نظر ڈال لے تو وہ ضرور ایسا کرے۔''

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ: ایک آدمی نے کسی عورت سے شادی کا عندیہ ظاہر کیا تو اللہ کے رسول نے سوال فرمایا: کیا تم نے اس کو دیکھا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا: جاؤ جا کر پہلے اس کو دیکھو کیونکہ ایسا کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ تمہارے مابین کا رشتہ پائیداری ودوام پائے۔'' (صحیح مسلم:3550)

**کمالیات وزوائد:**

لباس کے لیے کپڑے کی نوعیت اور سلائی کے انداز کی تعیین کے بعد بیشتر اوقات انسان اس میں مزید چیزیں لگا کر اور زیادہ حسین وجمیل بنانا چاہتا ہے۔ مثلاً اس کے لیے اچھے بٹنوں کا اہتمام یا ٹوپی یا مفلر اور رومال وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ ازدواجی زندگی میں بھی زوجین میں سے ہر ایک کی تمنا وآرزو ہوتی ہے کہ اس کا ساتھی دیگر صفات وصلاحیتوں کے علاوہ کچھ غیر معمولی خوبیوں کا حامل رہے۔ مثلاً اعلیٰ علمی اہلیت کا حامل ہو، یا اعلیٰ پائے کا مقرر وواعظ ہو یا حافظِ قرآن ہو یا آرائش وزیبائش میں ماہر ہو وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی ایسی اہلیت وصلاحیت کا حامل ہو، جو اس کے ہم عصر اقران ومصاحبین میں نایاب یا کمیاب ہے، اور اس کی وجہ سے انسان دوسرے امور کی طرح یہاں بھی اپنے جذبۂ افتخار کو تسکین بہم پہنچا سکے۔ یہ خواہش بھی اگر حدودِ دین سے متجاوز نہ ہو تو جائز ہوگی۔

**لباس کی خصوصیات:**

انسان جب لباس زیب تن رکھتا ہے تو بڑی حد تک لباس اس کے جسم سے چمٹا ہوتا ہے یا اس قدر قریب ہوتا ہے کہ دونوں میں فاصلہ یا دوری نا کے برابر ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی یہی صورت مطلوب ہے۔ زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ بیحد اپنائیت وہمدردی کا معاملہ برتنا چاہیے اور ہر ایک کو دوسرے کے احساسات وجذبات سے واقفیت اور نازک وحساس مسائل وحالات کا علم ہونا چاہیے۔

امام قرطبی اس قرآنی تشبیہ کے ضمن میں فرماتے ہیں: لباس کا اطلاق اصلاً کپڑوں پر ہوتا ہے۔ زوجین کے باہمی امتزاج واقتران کو لباس کی تشبیہ سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ زوجین بھی لباس ہی کی مانند ایک دوسرے سے مربوط اور لازم وملزوم ہوتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، قرطبی: 314/2)

ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیجیے کہ انسان کے لیے ایامِ شباب جسمانی قوت وصحت مندی کا زمانہ ہوتے ہیں۔ یوں تو انسان ہر موسم کے مطابق لباس میں تبدیلیاں کرتا رہتا ہے تاکہ وہ موسمی مضر اثرات میں مبتلا نہ ہو سکے۔ لیکن جوانی کے دور میں بڑی سے بڑی موسمی بد پرہیزی کے باوجود انسان امراض وآفات سے محفوظ رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر موسمِ گرما کی لو اور موسمِ سرما کے یخ بستہ جھکڑ یا بارشوں کے پانی میں خوب نہانا وغیرہ اس کے جسمانی نظام کو متاثر نہیں کرنے پاتے۔ اس صورتِ حال کے برعکس ایامِ پیری میں جب کہ انسان کا دفاعی نظام کمزور ہو جاتا ہے، ذرا سی بے احتیاطی اس کو بیمار کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس دور میں اسے ہر موسم میں اپنے لباس سے جڑے رہنے کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے جسمانی دفاعی نظام کی کمزوری طالب ہوتی ہے کہ جسم کو زیادہ سے زیادہ لباس میں ملبوس رکھا جائے۔ بالکل اسی طرح ازدواجی زندگی میں بھی پیرانہ سالی کے ایام میں زوجین کو ایک دوسرے کے ساتھ اور ایک دوسرے کی محبت ومودت کی نہایت درجہ ضرورت ہوتی ہے۔ عمومی مشاہدہ کی چیز ہے کہ زوجین خواہ کتنے ہی عمر دراز ہوں ایک دوسرے کے سہارے بقیدِ حیات صابر وشاکر رہتے ہیں، لیکن جہاں کسی ایک نے اس دارِ فانی سے رحلت کی تو مشکل ہوتا ہے کہ دوسرا بھی زیادہ ایام زندہ رہ پائے۔

## مصاحبت وتلازم:

انسان دنیا کے کسی گوشے میں سفر کر جائے اس کا لباس اس کے ساتھ رہتا ہے اور دونوں میں کسی صورت مفارقت پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ازدواجی زندگی میں بھی یہی فطری حالت مطلوب ومستحب ہے اور باہمی افتراق یا چند روزہ دوری کی اجازت حالتِ اضطرار ومجبوری ہی میں دی جا سکتی ہے۔ انسان غریب الوطن ہو یا مقیم، ہر حالت میں سکون واطمینان اور محبت ورحمت کا خواستگار ہوتا ہے، جس کا وجود اسی طور ممکن ہے کہ اس کا رفیقِ زندگی ہر آن وہر مکان اس کے ساتھ پایا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔ (روم: 21)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔''

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا کہ آپ اسفار وغزوات میں امہات المومنین کو ساتھ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اللہ کے رسول جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنے اہلِ خانہ میں قرعہ اندازی فرماتے اور جس کا نام نکلتا انھیں ساتھ لے جاتے۔

یہاں غور طلب بلکہ سنگین مسئلہ مسلمانوں کے اس نوکری پیشہ طبقہ کا ہے جو زیادہ کمائی کی خاطر بیرونی ممالک یا دور دراز علاقوں میں کام کرتے ہیں اور سالہا سال تک اپنے اہلِ خانہ کو زیارت وملاقات سے محروم رکھتے ہیں۔ بعض خلیجی ممالک کا حال تو یہ ہے کہ اس میں جانے کے بعد سہ سالہ مدت گزارے بغیر واپسی کے بارے میں سوچنا بھی ناممکن ہے۔ فقہی موشگافیاں کر کے اس طرزِ عمل کو جائز ٹھہرانے یا مجبوریِ حالات کے بہانے اس کو قابلِ انگیز قرار دینے سے، یہ غیر شرعی دنیا پرستانہ رویہ کس قدر درست قرار پاتا ہے، یہ دوسری بات ہے۔ لیکن جو بات مسلّم ہے وہ یہ کہ ایسا طرزِ عمل رشتۂ زوجین کے قرآنی تصور کے بالکل خلاف ہے۔

## گندگی وآلائش:

ہر انسان چاہتا ہے کہ لباس کو خراب کرنے یا ناپاک کر دینے والی کوئی معنوی ومادی گندگی اس کے لباس کو نہ لگے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ کوئی چیز اس کے لباس کو بدرنگ وبدبودار نہ کرے۔ ازدواجی رشتہ میں بھی زوجین سے مطلوب ہوتا ہے کہ وہ اس رشتہ کی ہمہ وقتی حفاظت ونگرانی رکھیں تاکہ ان کا یہ رشتہ ورابطہ ہمیشہ خوش شکل، خوش مذاق، اور خوشبودار باقی رہے۔ زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے کی شخصیت کا اعتراف واحترام کرتے ہوئے، حسنِ معاشرت کو مکدر کرنے والی تمام غلط فہمیوں اور خامیوں کو نرمی وہمدردی کے ساتھ سدھار دینا چاہیے۔ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس بارے میں مشعلِ راہ ہے۔ آپ ہمیشہ ازواجِ مطہرات کی ناروا باتوں پر ضبط وتحمل اور اہلِ خانہ کی ناراضگی کا سبب بننے والی چیزوں سے احتراز فرماتے تھے۔ ازواجِ مطہرات کی چھوٹی چھوٹی پسند وناپسند کو نوٹس میں رکھنے کی مثال یہ واقعہ ہے:

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا: میں تمہاری رضامندی وعدمِ رضامندی کو پہچان لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ کے استفسار پر آپ نے فرمایا: تم رضامندی کی حالت میں قسم کھاتے ہوئے کہتی ہو کہ قسم محمد کے معبود کی، جبکہ ناراضگی کی حالت میں کہتی ہو کہ قسم ابراہیم کے معبود کی۔ یہ سن کر حضرت عائشہ نے فرمایا: میں صرف آپ کا نام لینا چھوڑتی ہوں۔ (صحیح بخاری: 6078)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زوجین میں سے ہر ایک کو خانگی رشتے

میں کسی بھی شک وشبہ یا غلط فہمی کے شائبہ کو جگہ نہیں دینی چاہیے اور خدانخواستہ اگر ایسی صورتِ حال واقع ہوجائے تو فوری طور پر اس کے ازالہ وتلافی کی سبیل کر لینا چاہیے۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھنے سے ازدواجی رشتہ ہمیشہ سرسبز وشاداب رہتا ہے۔ حضرت عمران بن حطان کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کی اہلیہ نہایت شکیل وجمیل تھیں، جبکہ خود آنجناب کا حال ایسا نہ تھا۔ روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی بیوی کو مخاطب فرما کر کہا: تم اور میں ان شاء اللہ جنتی ہیں۔ اس پر اہلیہ نے تعجب ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم حسن وجمال میں مجھ سے بہتر ہو، جس پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، اور میں تم سے شکل وصورت میں فروتر ہوں جس پر تم صبر واحتساب رکھتی ہو۔ اس لیے ان شا اللہ ہم دونوں اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔'' (العقد الفرید، ابن عبدربہ: 431/2)

معلوم ہوا کہ زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے کی خوبی اور واقعی حیثیت کا اعتراف کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی وجہ سے بے تکلفی ومحبت اور احسان مندی ومحسن شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو کسی بھی ازدواجی رشتہ کے لیے از حد ضروری ہے۔

بسا اوقات انسان کا لباس تو صاف ستھرا ہوتا ہے لیکن دھونے یا کثرت سے استعمال کرنے کی وجہ سے اس میں سکڑاؤ اور انکماش پیدا ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے سکڑے ہوئے کپڑے کا علاج استری کے ذریعہ اس کو پھیلا کر کیا جاتا ہے۔ خانگی سعادت وخوشحالی کے حصول کی راہ میں بھی بسا اوقات چھوٹی چھوٹی چیزیں اختلافات اور ہلکی پھلکی جھڑپ کا سبب بن جاتی ہیں۔ ایسے میں خانگی رشتہ کو بھی ایک قسم کا انقباض وانکماش لاحق ہوجاتا ہے، جس کے بعد ضرورت ہوتی ہے کہ ازدواجی رشتہ کی تازگی بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا بہترین راستہ آپسی تفاہم، بے غرضی وانکارِ ذات اور بعض غلطیوں سے اغماض واعراض کرنا ہے۔ اس وسیلہ سے ازدواجی رشتہ کو لاحق انقباضی کیفیت ختم ہوکر فرحت وانبساط میں بدل جاتی ہے۔ واضح رہے جس طرح بروقت سکڑے ہوئے کپڑے کو درست نہ کرنے پر دھیرے دھیرے یہ حالت کپڑے کا جزوِ لازم بن جاتی ہے اور پھر اس کا ازالہ مشکل تر ہوجاتا ہے، اسی طرح خانگی رشتہ میں بھی وقتی انقباض وناراضگی کو طول دینے سے بسا اوقات یہ چیز مستقل درد سر بن جاتی ہے اور صورت حال کی اصلاح بیحد مشکل ہوجاتی ہے۔

**انقطاع وانخراق:**

بسا اوقات انسان کا لباس کٹ یا پھٹ جاتا ہے جس کے بعد اس کو رفو کرنے اور سینے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس طرح لباس کو صحیح سالم باقی رکھا جاتا ہے۔ اگر پھٹے کپڑے کو جلد از جلد سینے کا اہتمام نہ کیا جائے تو اس پھٹن کا دائرہ وسعت اختیار کرجاتا ہے اور کبھی کبھار اس حد کو پہنچ جاتا ہے جہاں اس کو بحیثیت لباس استعمال میں لانا محال ہوجاتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی بسا اوقات بڑی مشکلات اور گہرے اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں جن کا بروقت ازالہ وخاتمہ نہ کیا جائے تو مستقل انقطاع ولاتعلقی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ عربی زبان میں رفو کرنے کا لفظ سلائی کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور شادی کے بعد اتفاق ویگانگت کے معنی میں بھی۔

احادیث میں بھی یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسان کو شادی میں اتفاق واتحاد کی دعا دیتے ہوئے فرماتے تھے: اللہ تمہارے لیے برکت مقدر کرے اور تم پر برکت رکھے اور تم دونوں کے مابین خیر میں اجتماع فرمائے۔''

**بے نیازی واستغنا:**

اگر انسان بڑی کدوکاوش کے بعد کسی بے عیب وخوبصورت لباس کا انتخاب کرے، لیکن پھر اچانک ہی اس کو اتار کر پھینک دے اور خود کو اس سے مستغنی ظاہر کرنے لگے، یا کہے کہ میں برہنہ رہنا پسند کرتا ہوں یا یہ کہ میں اپنے لیے دوسرا لباس منتخب کروں گا، تو عقلِ عامہ ایسے انسان کو پاگل قرار دیتی ہے۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نے اپنے انتخاب میں غلطی کی تھی؟ کیا تم نے یہ لباس محنت کی حلال کمائی سے نہیں خریدا تھا؟ کیا اس لباس میں پایا جانے والا عیب یا نقص ناقابلِ اصلاح وتحمل ہے؟ کیا تم نے اس عیب یا نقص کی اصلاح وتلافی کرنے کی کوشش کی؟ ان تمام اعتراضات وسوالات کا تسلی بخش جواب نہ دینے پر ایسے شخص کو متکبر ونخوت پسند اور فضول خرچ ومسرف کے خطاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ازدواجی امور میں بھی زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کے تئیں تعامل اگر بے نیازی ولاتعلقی کا ہے تو اس پر بھی یہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور یہی حکم اس پر بھی لگایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جواز کی صورت تب ہی ہے جب کہ معاملہ اس حد کو پہنچ جائے کہ کسی طور گزارے کا امکان باقی نہ رہے اور علیحدگی وانفصال کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: حلال چیزوں میں اللہ کو ناپسندیدہ ترین شے طلاق ہے۔'' (سنن ابوداؤد: 2180۔ سنن ابن ماجہ: 2018)

یہ چند بنیادی باتیں ہیں جو قرآن کی اس تشبیہ کی روشنی میں بظاہر سمجھ میں آتی ہیں۔ یہاں ایک تنبیہ ضروری یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں وارد مختلف تمثیلات وتشبیہات کے تضمنات میں کسی ایسے امر کو شامل کرنا جس کی تائید قرآن وسنت کی دیگر واضح نصوص سے نہیں ہوتی، یا اس کے معارض شرعی نصوص پائے جاتے ہیں، تو ایسا استنباط کسی نے بھی انجام دیا ہو غلط قرار پائے گا۔ مثلاً اس قرآنی تشبیہ کی روشنی میں یہ کہنا کہ لباس ہی کی طرح زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے پر حقوقِ مالکانہ حاصل ہوجاتے ہیں یا لباس ہی کی طرح زوجین کو بھی ہر ماہ وسال میں شریک زندگی تبدیل کرتے رہنا چاہیے، بر خود غلط ہوگا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہم سبھی کو صحیح فہم قرآن کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رحمٰن ورحیم! ◻◻

صادق رضامصباحی ☆

# نجات کے لیے صرف اچھے اعمال کافی نہیں

دین ہو کہ دنیا زندگی عمل سے ہی بنتی ہے۔ اگر عمل بہتر ہے تو اس کے اچھے اثرات زندگی پر ضرور پڑیں گے اور اگر عمل برا ہے تو اس کے منفی اثرات مرتب ہونا بھی فطری ہے۔ اس سے جہاں دین سنورتا ہے وہیں دنیا میں بھی سرخروئی حاصل ہوتی ہے۔ اگر دنیا کے لیے محنت کریں گے تو دنیا مل جائے گی اور اگر دین کے لیے محنت کریں گے تو دین حاصل ہو جائے گا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دین اور دنیا کوئی الگ الگ چیزیں ہیں بلکہ اگر دین کی تعلیمات پر غور کیا جائے تو دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں نظر آئے گا۔ اس سے ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ دین اور دنیا کو نہ صرف ایک ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ دونوں جگہ عزت و وقار کے ساتھ زندگی بھی گزاری جا سکتی ہے۔ اعمال وہ بنیادی پتھر ہیں کہ جن پر زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے مگر یہ بات بھی گرہ باندھ لینے کی ہے کہ صرف خالی عمارت اس وقت تک اچھی نہیں لگتی جب تک کہ اس میں رنگ و روغن، آرائش و زیبائش اور دیدہ زیبی نہ ہو۔ اگر عمارت ان تمام خوبیوں سے مزین ہوگی تو وہ مرکز نظر بن جائے گی اور دیکھنے والا مکین کے ذوق جمال کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کی عمارت اس وقت تک قابل دید نہیں ٹھہرے گی جب تک کہ اس میں محبت رسول اور جذبۂ عشق رسول کا آفتاب اپنی کرنیں نہ بکھیرتا ہو اور اس کی دیواروں پر عشق رسول کی چاندنی نہ چھٹکی پڑتی ہو۔ یہ بات یوں ہی نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ اس کے پیچھے احادیث کریمہ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ذیل ہم صرف ایک حدیث پیش کر رہے ہیں۔

ایک صحابی بارگاہِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور! قیامت کب آئے گی؟ حضور نے ارشاد فرمایا: **ما اعددت لها** یعنی تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ انھوں نے عرض کیا: **ما اعددت لها** یعنی میں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی مگر یہ کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے بہت محبت کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''تم جس سے محبت کرتے ہو قیامت کے دن اسی کے ساتھ رہو گے۔''

حضرت انس جو اس حدیث کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ اس دن سب صحابہ بے حد خوش ہوئے۔ میں نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ کبھی خوش نہیں دیکھا یعنی لوگوں کو بے انتہا خوشی صرف دو بار حاصل ہوئی تھی ایک اس وقت جب انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور دوسرا اس دن جب سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔

ایک بات توجہ کے قابل یہ ہے کہ حضور نے جب صحابی سے یہ پوچھا کہ تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے تو اگر صحابی چاہتے تو کہہ دیتے کہ حضور! میں نے یہ یہ اچھا کام کیا اور یہ یہ نیکیاں کیں۔ وہ اگر اپنی نیکیاں گنواتے تو ان کے لیے بجا تھا کیوں کہ انہوں نے تو حضور کی صحبت پائی تھی، ان کے پیچھے نماز پڑھی تھی، ان کے ساتھ جہاد کیا تھا، ان کے ہر حکم پر عمل بجا لائے تھے اور اپنے رات و دن حضور کی صحبت میں صرف کیے تھے اس لیے وہ اگر اپنے اعمال گنواتے تو شاید حضور ان سے کچھ نہ کہتے۔ اس کے باوجود صحابیِ رسول ﷺ نے اپنے اعمال کی فہرست نہ پیش کر کے یہی کہا کہ میرے پاس سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو محبوب رکھتا ہوں۔ ان کے اس جواب سے اس زمانے کے لوگوں کے جذبۂ محبت خدا اور رسول کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے برخلاف ہم اگر آج کے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو یہ محسوس کریں گے کہ تقریباً نوے فی صد حضرات کو اپنے اعمال اور اچھے کاموں پر بھروسہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے اچھے اعمال کے سبب جنت میں جائیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ عزوجل پر سے ان کا بھروسہ بھی اٹھتا جا رہا ہے اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت بھی دل سے رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ آپ ان میں سے اگر کسی سے اس بابت پوچھیں گے تو اکثر یہی کہیں گے کہ ہاں میں تو بچپن سے ہی نمازی ہوں، جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہوں، ہر سال زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات دیتا ہوں، کئی حج اور عمرے کر چکا ہوں، میں نے فلاں فلاں رفاہی اور فلاحی کام کیے ہیں اور میں اتنے مدرسوں کو ہر سال چندہ دیتا ہوں۔ میں یہ کرتا ہوں اور میں وہ کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

الغرض وہ اپنے نیک کاموں کی طویل فہرست آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔ آج لوگوں کی عمومی سوچ یہ بن چکی ہے کہ وہ اچھے کاموں کو جتاتے

☆ممبئی، موبائل: 09320884970، ای میل: adiqraza92@gmail.com

پھرتے ہیں۔ کسی پر احسان کیا تو اسے جتلا کر دوسرے کو شرمندہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مدعا یہی ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اپنے اعمال پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں گویا انہوں نے اسے جنت خریدنے کی نقدی سمجھ لیا ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا وہاں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے لیے کوئی جگہ ہے؟ وہ صحابی جو ہم سے کروڑ ہا کروڑ درجے اونچے مرتبے پر فائز ہیں اور ان کے اعمال کی قبولیت کا پوچھنا ہی کیا۔ جب ان کی نظر میں ان کے اعمال کی کوئی حقیقت نہیں تو ہما شما کس قطار میں ہیں؟ ہمارا اچھا سے اچھا اور بڑا سے بڑا عمل بھی ان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کے سامنے ذرۂ ناچیز سے بھی کم ہے۔ ذرا سوچیے کیا ایسا نہیں؟

مذکورہ حدیث سے کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

(1) اسلام کا درخت اسی وقت ثمر بار ہوگا جب اس کی جڑیں محبت رسول کی زمین میں گہرائی سے پیوست ہوں گی۔

(2) تمام صحابہ عاشق رسول تھے۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ حدیث کے راوی حضرت انس کے مطابق سرکار کا یہ فرمان سننے کے بعد تمام صحابہ اتنا زیادہ خوش ہوئے جتنا وہ اسلام لانے کے بعد خوش ہوئے تھے۔

(3) ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں۔ دانش مند مسئول کو سائل کے اس کے احوال اور اس کے فائدے کے پیش نظر جواب دینا چاہیے۔ سائل نے سوال یہ کیا تھا کہ حضور! قیامت کب آئے گی؟ مگر حضور نے اس کے جواب میں الٹا یہ سوال فرما دیا کہ تم نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟ حضور چاہتے تو سوال کا جواب عنایت فرما دیتے مگر شاید اس سے سائل کو اور صحابہ کو وہ سرور و کیف نہ ملتا اور وہ فوائد حاصل نہ ہوتے جو سرکار کے پلٹ کر سوال کرنے اور اس صحابی کے جواب دینے کے بعد ملے۔

(4) اپنے اعمال اور نیکیوں پر فخر نہ کرنا چاہیے کیوں کہ اس کی قبولیت کا مدار اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر ہے۔

(5) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تربیتی انداز بھی معلوم ہوتا ہے۔ طالب علموں اور اپنے سے چھوٹوں کی تربیت کس طرح کرنی چاہیے۔ یہ حدیث اس سلسلے میں اچھے ڈھنگ سے رہنمائی کرتی ہے۔ انہیں کس طرح کے جواب سے فائدہ ہوگا اور کس طرح سے نہیں نہایت عمدگی کے ساتھ یہ حدیث ہماری لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔

اگر ہم اسلامی تعلیمات پر سنجیدگی اور ہوش و ہواس کے ساتھ غور کریں تو یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے کہ محبت رسول بالکل فطری چیز ہے اور اگر فطری نہ بھی ہو تو فطرت کے بہت قریب ہے۔ ذرا غور کیجیے ہمیں اپنے بچوں، بیوی، والدین اور بھائی بہنوں سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص ہمیں محبوب ہوتا ہے جس نے ہمارے ساتھ بھلائی کی ہوتی ہے۔ ہماری کامیابی کے پیچھے جس شخص کا بھی ہاتھ ہوتا ہے ہم اس کے اسیر ہو جاتے ہیں تو کیا جس کے صدقے یہ جہان بنا، دنیا جہاں کی رنگینیاں، بوقلمونیاں، رعنائیاں، دل فریبیاں اور شادابیاں وجود میں آئیں اور ہم جس کی وجہ سے خیر الامم کے لقب سے سرفراز کیے گئے کیا ہم اس سے محبت نہ کریں؟ اس کے احکام پر عمل نہ کریں، اس کے آئینۂ حیات میں اپنی حیات کے بال و پر کا جائزہ نہ لیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو یقین جانیے ہم بالکل غیر فطری راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ سب سے بڑی محسن کشی ہے اور سب سے بڑی احسان فراموشی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اعمال نہ کیے جائیں بلکہ صرف محبت رسول اور عشق رسول میں سرشار رہنے کا دعوی کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کے بغیر جو بھی شخص محبت رسول کا دعوی کرتا ہے وہ اپنے دعوی میں جھوٹا ہے۔ محبت رسول کا تقاضا ہی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر فرمان پر عمل کیا جائے کیوں کہ محبوب کی ہر ادا کو حرز جاں بنایا جاتا ہے اور اس کے ہر ہر حکم پر عمل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا محبت رسول کا دعوی اسی وقت صحیح ہوگا جب اس کے ساتھ اعمال بھی ہوں۔ اس پوری گفتگو کو دو لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے اعمال بغیر محبت رسول کے قبول نہیں کیے جائیں گے اور محبت رسول کا تقاضہ یہ ہے کہ محبوب کی ہر آواز پر لبیک کہا جائے اور ان کی حیات کو اسوہ بنایا جائے۔ □□

## قلم کاروں سے درخواست

- براہِ کرم مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
- سطروں کے درمیان مناسب فاصلہ چھوڑیں۔
- اشعار و اقتباس صحت کے ساتھ نقل کریں۔
- کمپوز کیے ہوئے مسودے کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔
- ممکن ہو تو مسودہ کے ساتھ سی ڈی یا ای-میل کریں۔
- پتے کے ساتھ اپنا ای میل بھی لکھیں۔

مفتی محمد علاؤ الدین قادری رضوی ☆

# مپندار سعدیؔ کہ راہ صفا

(آخری قسط)

گذشتہ سطور میں گستاخانِ رسول کے تعلق سے گفتگو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور سربراہانِ مملکت اسلامیہ کے اقوال وافعال، احکامات و فرمودات پر مبنی تھیں۔ اب ذیل میں ائمۂ کرام اور علمائے کرام کے موقف درج کیے جا رہے ہیں کہ آیا اگر کوئی جان بوجھ کر ہوش وحواس سے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گستاخی کرے یا لکھے تو کیا ایسوں کی توبہ قابل قبول ہے یا نہیں۔

**امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا موقف :**

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ جو بھی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیزار ہو یا جھٹلایا وہ مرتد ہے۔ اور حلال الدم مگر یہ کہ لوٹ آئے۔
(الشفا کذا فی رسائل ابن عابدین)

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے بعد سزا نہ دی جائے گی۔ جیسا کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ والرضوان فرماتے ہیں جس مسلمان نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو گالی دی یا جھٹلایا یا کسی طرح کا عیب لگایا تو اس نے اللہ عزوجل سے کفر کیا اور اس کی بیوی مطلقہ ہوگئی اگر توبہ کرے تو ٹھیک ورنہ قتل کر دیا جائے۔ (کتاب اخراج)

یہاں ارتداد مجرد اور ارتداد مغلظ کی سزا میں فرق ہے جیسا کہ صاحب در مختار لکھتے ہیں: کہ جس نے ردت کو اختیار کیا تو اس کی توبہ قبول کی جا سکتی ہے مگر وہ لوگ کہ جس کا ارتداد مکرر ہو چکا ہو۔ یا وہ کافر جو کسی نبی کو گالی دینے سے خارج از اسلام ہو چکا ہو تو بلا شبہ اسے بطور حد قتل کیا جائے گا۔ اور اس کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔

**امام مالک کا موقف :**

خلیفہ ہارون رشید نے حضرت امام مالک سے یہ فتویٰ پوچھا کہ اگر کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گستاخی کرے تو حکم کیا ہے؟ چہ جائے کہ عراق کے بعض فقہا نے کوڑوں کی سزا دینے کا فتویٰ صادر فرمایا، بس امام مالک غضب ناک ہوگئے اور فرمایا اے امیر المومنین! اس امت کے وجود کا کیا جواز ہے؟ کہ جس میں اس کے نبی کی گستاخی رواج پا جائے۔ نیز فرمایا: جو انبیا میں سے کسی نبی کی گستاخی کا مرتکب پایا جائے اس کو قتل کیا جائے گا۔ اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب کی گستاخی پر کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ (الشفا ج۲ ص۱۹۶)

**امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا موقف :**

حضرت امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا نظریہ بھی یہی ہے کہ گستاخ رسول کو قتل کیا جائے۔ اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ یعنی جس طرح حد قذف توبہ سے ساقط نہیں ہوتی اسی طرح آقا علیہ السلام کو گالی دینے سے جو قتل واجب ہوا وہ توبہ سے ساقط نہ ہوگا۔ نیز گستاخ رسول کے حکم قتل میں چاروں ائمہ کرام کا اتفاق ہے۔ (فتاویٰ شامی ج۳ ص۳۲۱)

**قاضی عیاض کا موقف :**

حضرت قاضی عیاض نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ادنیٰ گستاخی پر بھی قتل کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں: ہم اس حکم میں قطعاً کوئی استثنا نہیں کرتے اور نہ ہی ہمیں کوئی شک ہے خواہ صراحتاً توہین ہو یا اشارتاً یا کنایتاً اور عہد صحابہ سے لے کر آج تک تمام علمائے امت اور اہل فتویٰ کا اس پر اجماع ہے۔ (الشفا ج۲ ص۲۱۴)

**امام محمد کا موقف :**

امام محمد اجماع نقل کرتے ہیں: محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو گالی دینے والا اور توہین کرنے والا کافر ہے۔ عذاب خداوندی کے وعید کا مستحق ہے اور اس کا حکم امت کے نزدیک یہ ہے کہ اسے قتل کیا جائے۔ اور جو شخص اور اس کی سزا میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ اور اس پر علما کا اجماع ہے۔ (ردالمختار ج۳ ص۳۱۷)

**الخطابی کا موقف :**

میری معلومات میں کسی مسلمان نے بھی گستاخ رسول کے واجب القتل ہونے میں اختلاف نہیں کیا۔ (فتح الباری ج۱۲ ص۲۸۱)

صاحب محیط کے نزدیک گستاخ رسول کی توبہ نہ اللہ کے ہاں اور نہ لوگوں کے ہاں مقتول اور قتل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ یہی حکم ہے۔ اور اس پر تمام متاخرین علما اور اکثر متقدمین کا اجماع ہے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص ۳۸۶)

قاضی عیاض نے مشہور مالکی فقہا کا فتویٰ مختلف امور کے بارے میں نقل کیا ہے۔ ہر مقدمے کا فیصلہ بعض علما نے صادر کیا کہ اسے قتل کیا جائے اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ (الشفا ج۲ ص۱۹۱)

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی رسول گرامی وقار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تنقیص نہیں کرتا ہے مگر آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پسند پر عدم پسندگی کا اظہار کرتا

☆بانی وسربراہ انجمن ثنائیہ دارالیتیمی ایجوکیشنل ٹرسٹ، میرا روڈ، مہاراشٹر موبائل: 09224455977

ہے یا پھر آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم واختیار، اعضاے مبارکہ میں سے کسی عضو کی گستاخی کرتا ہے جب بھی وہ شخص واجب القتل گردانا جائے گا۔

**امام شہاب الدین خفاجی کا موقف:**

امام شہاب الدین خفاجی حنفی لکھتے ہیں: توہین رسالت کے ضمن میں حکم کفر کا انحصار ظاہر پر ہے اس کے قصد ونیت اور قرائین حال کو نہیں دیکھا جائے گا۔

اس حکم کے ضمن میں وہ لوگ جو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ لکھتے ہیں کہ معاذ اللہ مر کر مٹی میں مل گئے، کیا حکم ہوگا...... وہ ظاہر ہے پھر بھی لوگ ایسی گستاخانہ کلمات پر مشتمل کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اور پڑھنے کو عین ثواب بتاتے ہیں اور پھر طرح طرح سے تاویل کرتے ہیں کہ ہمارا مقصود تو یہ ہے کہ وہ مٹی سے مل گئے۔ (معاذ اللہ) اولاً تو آقا علیہ السلام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مرگئے کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ چہ جائے کہ وہ مٹی میں مل گئے کہنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ امام احمد رضا قادری برکاتی فرماتے ہیں:

انبیا کو بھی اجل آنی ہے — بس اتنی کہ فقط آنی ہے

اور ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراحتاً گالی دے وہ واجب القتل ہے۔ (نیل الاوطار ج ۷، ص ۳۸۰)

علامہ خیر الدین حنفی لکھتے ہیں: اگر کسی نے کسی کے علم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زیادہ رکھنا بتایا تو اس نے آقا علیہ السلام کی نسبت عیب ونقص سے منسوب کیا۔ لہٰذا ایسا شخص کافر ہو جائے گا۔ (نسیم الریاض، ج ۴، ص ۳۳۵)

تاریخ اسلام میں ایسے بھی محروم القسمت عالم گزرے ہیں جنھوں نے معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو شیطان کے علم کے مساوی بتایا ہے اور انھیں اس غلیظ قول وعمل سے توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ نقارۂ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہوئے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے ساتھ دوستی اور ہم نشینی اور طرح طرح کے بہانے بنا کر دنیوی رشتے استوار کرتے ہیں اور عیش وعشرت کے اس بے لذت بے وفا دنیا میں انھیں فرمانِ الٰہی کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ **فقد کفرتم بعد ایمانکم**۔ کہ تم ایمان لانے کے بعد بھی کافر ہوگئے، بہانے مت بناؤ۔

دیکھئے لوگ دھڑلّے سے گناہ پہ گناہ کیے جارہے ہیں جسے دیکھو وہ چوک چوراہے، نکڑ، گلی کوچے، چائے پان کی دوکانوں اور بازاروں میں بیٹھے غیبت چغلی اور دوسروں کی برائی میں لگے ہیں مگر جب انہیں کبھی مسجد جانے کا موقع مل بھی گیا تو معاذ اللہ کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کو شرک وبدعت سے تعبیر کرتے ہیں، بھلا ان ناعاقبت اندیشوں کو معلوم نہیں کہ درود وسلام عبادتوں میں ایک ایسی عبادت ہے کہ کبھی بھی، کسی وقت بھی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بصد ادب واحترام کی جاسکتی ہے۔ واضح ہو کہ درود وسلام کی کثرت جسم کو جسمانی صحت وتوانائی تو بخشتی ہے، دل وزبان کو صاف ستھرا بھی رکھتی ہے۔ اور یہ تقویٰ پر معین ہے۔ تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ آدمی جسے پیار کرے اس کو بیٹھ کر تو یاد کرے۔ اور کھڑے ہوں تو بھول جائیں۔ محبت کہتے ہی ایسی کیفیت وحال کو کہ محبّ کھڑا ہو یا بیٹھا ہر صورت ان کی یاد ستاتی اور تڑپاتی رہتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت کی سب سے بڑی دلیل درود وسلام کا کثرت سے پڑھنا ہے۔ تو خبر دار کسی بھی نوعیت ولحاظ سے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گستاخی نہ ہونے پائے۔ یہاں تک کہ ان سے منسوب چیزوں کی بھی نہیں۔ یہی شیوۂ مومن ہے، چونکہ ہر غلطی اور خطا کے لیے معافی ہے سوا شرک جلی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گستاخ کے لیے نہ تو توبہ قابل قبول اور نہ کسی طرح کی معافی کا پروانہ ہے۔

**امام خیر الدین حنفی کا موقف:**

گستاخِ رسول کو حداً قتل کیا جائے گا اور اصل یہی ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اور یہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ نیز پوری امت کا اجماع اس پر نقل کیا ہے کہ گستاخِ رسول کافر ہے اور اس کی توبہ نہیں اور جو لوگ اس کے عذاب وکفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ (فتاویٰ خیریہ ج، اول، ص ۱۷۰، ۱۷۱)

جماعت اہل سنت کے عظیم ترجمان اعلیٰ حضرت حضرت امام احمد رضا قادری محدث بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں جنہیں آپ ہم اور سب جانتے ہیں کہ وہ ایک عاشق رسول تھے اسی عشق ومحبت کا نتیجہ ''حدائق بخشش'' ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں لکھی ہے اور مقبول عام وخاص ہے۔ دیوان کا ہر شعر عشق کا موجیں مارتا سمندر ہے۔ علم وعرفان کا وہ دریا ہے کہ بڑے سے بڑا غوطہ زنی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کہنے اور لکھنے کے لیے تو ایک کتاب ہے مگر فرامین کا ایک نہیں کئی دفتر ہے۔ شعر ونظم اور غزل کے ہر صنف وقسم میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ مگر زبان وقلم ہر لغزش سے پوری طرح محفوظ ہے اور کیوں نہ ہو خود لکھتے ہیں:

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

آداب رسول کی بجا آوری اور عشق رسول کی تڑپ، محبت کا سوز وگداز اور محبوب ومحبّ کا سبق تو کوئی امام احمد رضا سے سیکھے، خود کہتے ہیں:

آ کچھ سنادے عشق کے بولوں میں اے رضا
مشتاق طبع لذت سوز جگر کی ہے

یہ کوئی دنیاوی عشق نہیں جو دیوانہ بنادے، ہوش وحواس باختہ کردے، باعث ننگ و عار ہو، فرضی ہو، عارضی ہو، بنیاد پرستی پر مبنی ہو، اسے کون عشق محبت کہتا ہے......؟ وہ تو نفس امارہ کی بے ہودگی ہے۔ اللہ ورسول کی ناراضی کا باعث ہے۔ دنیاوآخرت کی تباہی کی مشین ہے۔ ایسا عاشق تو شیطان کا کھلونا ہے۔ اس سے شیطان اسی طرح کھیلتا ہے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے گیند سے کھیلا کرتے ہیں۔ ایسے عاشق کے تعلق کی دیوار ذاتی منفعت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اسے رضائے الٰہی سے کیا کام! محبت رسول یا حکم رسول سے کیا غرض۔ وہ جہاں چاہتا ہے چاہتا ہے چلا جاتا ہے، جو چاہتا ہے بولتا اور لکھتا ہے۔ فرامین الٰہی کا ذرا بھی پاس ولحاظ نہیں۔ احادیث رسول کا کچھ بھی خیال نہیں۔ یہ بات تلخ ہے مگر سچ ہے۔ سچی بات کڑوی جو ہوتی ہے۔ صدق وصفا سے آمیز شربت پی سکو تو پی لو۔ بھلا ہوگا، مرادیں برآئیں گی، بگڑی تقدیر سنور پڑے گی، بخت خفتہ جاگ اٹھے گا، تاریکیاں دور ہوں گی، نور وبصیرت سے قلب منور وتاباں ہوگا۔ بخت یار کی دوستی سے مالا مال ہوں گے۔ **من عرف نفسہ فقد عرف ربہ** کی معرفت حاصل ہوگی۔ خود کی خودی کو پہچانو، دوسروں کو مت دیکھو، اپنا احتساب خود کرو کیوں کہ تمہیں خود اپنا حساب دینا ہے۔ اپنی کتاب خود پڑھنی ہے، اپنا اعمال نامہ اپنے ہاتھ لینا ہے۔ پھر اِدھر اُدھر کی چھوڑ اپنی بات کر، اپنے مولیٰ سے دل لگا، اپنے رسول سے محبت کر، انہیں پر بھروسہ رکھ کہ وہی اپنی کشتی کے کھون ہار ہیں۔ وہی آقا اور داتا ہیں، انہیں سے سب ہے۔ انہیں کا سب، امام احمد رضا قادری برکاتی کہتے ہیں:

انہیں کی بو مایۂ سمن ہے انہیں کا جلوہ چمن چمن ہے
انہیں سے گلشن مہک رہے ہیں انہیں کی رنگت گلاب میں ہے

کریم ایسے کہ بن مانگے دیں، ہاتھ اٹھنے نہ پائے کہ دامن مراد بھر دیں، خود نہ کھائیں، تمہیں کھلا دیں، خود تو معصوم ہیں مگر ہمارے گناہوں کو یاد کر کر کے روئیں، شب بیداری ایسی کہ امت بے خوف سوئے مگر آقا ہیں کہ امت کے لیے رات رات بھر بارگاہ ایزدی میں گریہ وزاری کریں۔ کسی نے کہا آقا مجھ سے بہت گناہ سرزد ہو چکے ہیں، کیا رب العزت بخش دے گا......؟ فرمایا تیقن کرو کہ تمہارے گناہ رب کی رحمت سے زیادہ نہیں وہ بخشش کرنے والا ہے۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ توبہ کرو، معافی چاہو، بخش دیے جاؤ گے۔ فرمایا جب تک میری امت کا ایک ایک فرد جنت میں نہیں چلا جاتا شفاعت کا طالب رہوں گا، یہاں تک کہ پوری امت اجابت جنت میں ہوگی۔ پھر اے مومنو! یہ اضطراب کیسا؟ یہ پریشانی کیسی؟ یہ دردر بھٹکنا کیسا؟ آخر متفکر کیوں ہو؟ جہاں کے خزانے اور اس کی کنجیاں اسی کریم کے ہاتھوں میں ہے۔ وہی قاسم، انہیں سے ملتا ہے، ہر درد وقلب کا وہی مداوا ہے، وہی مطلوب، مقصود مومن ہے۔ خدا کی ساری خدائی انہیں کے طفیلی ہے۔ امام احمد رضا کے تیقن کا احساس کر سکو تو کرو!!!! کہتے ہیں:

کریم ایسا ملا کہ جس کے کھلے ہیں ہاتھ اور بھرے خزانے
بتاؤ اے مفلسو! کہ پھر کیوں تمہارا دل اضطراب میں ہے

اضطراب چھوڑو، احتساب کرو، کہ کہیں ہم گستاخ رسول کے تئیں نرم گوشہ تو نہیں رکھتے۔ اللہ اور اس کے حبیب کے دشمنوں سے دوستی تو نہیں کر بیٹھے ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تقویٰ اور سنت کے نام پر محبت رسول سے دل خالی تو نہیں کر رہے ہیں۔ سنو! چور، ڈاکو، زناکار، مختلف حیلے بہانے اور صاف ستھرے کپڑے میں ملبوس ایمان وایقان کی دولت پر قدغن لگانے آتے ہیں، وہ فریبی ہیں، ان کے فریب سے بچو، ہاتھ میں تسبیح کے سوسودانے، زبان پر ورد الٰہی کی رٹ اور دل بغضِ رسول کا پلندہ۔ ایسے لوگوں کے بارے میں امام احمد رضا کی تحریر پڑھیں اور عبرت حاصل کریں،

**امام احمد رضا کا موقف:**

نشہ کی حالت میں کسی مسلمان کے منہ سے کلمہ کفر نکل گیا تو اسے کافر نہ کہیں گے اور نہ سزائے کفر دیں گے، مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی وہ کفر ہے کہ نشہ کی بے ہوشی سے بھی صادر ہو تو اسے معافی نہ دیں گے۔ (فتاویٰ رضویہ ج۶،ص۴۰)

اور آپ کے شاگرد رشید حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی علیہ الرحمہ والرضوان لکھتے ہیں: مرتد اگر ارتداد سے توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہے مگر بعض مرتدین مثلاً کسی نبی کی شان میں گستاخی کرنے والا ایسا ہے کہ اس کی توبہ ہرگز قبول نہیں۔ (بہار شریعت حصہ۹،ص۱۶۶)

الحمدللہ ہم اہل سنت و جماعت کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ اگر کوئی اللہ عز وجل کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں کچھ بھی گستاخی کا مرتکب پایا گیا تو حداً قتل کیا جائے گا اور توبہ قبول نہیں، یعنی ہر صورت میں اسے سزا دی جائے گی۔ شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ والرضوان احقاق حق اور ابطال باطل کی گتھی سلجھاتے ہوئے خوب لکھتے ہیں:

میپندار سعدی کہ راہِ صفا
بہ منزل نہ جز بر پئے مصطفیٰ

□□

مولانا عبدالمجتبیٰ رضوی

# حضرت امام محمد باقر — حیات، افکار، تعلیمات

حضرت امام جعفر صادق مدینہ منورہ میں واقعہ کربلا کے تین برس قبل بروز جمعہ بتاریخ 3 صفر المظفر 57ھ مطابق 676ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام پاک محمد، کنیت ابوجعفر ومبارک اور لقب سامی، شاکر اور ہادی ہے۔

(مسالک السالکین، ج1، ص213)

آپ حدیث میں اپنے والد ماجد سیدنا علی بن الحسین وابن عباس وجابر بن عبداللہ وابوسعید خدری وحضرت بی بی عائشہ وبی بی امّ سلمہ وغیرہا صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے محبوب تلامذہ میں سے ہیں۔

(اولیائے رجال الحدیث)

آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی فاطمہ جن کو امّ عبداللہ بھی کہتے ہیں (دختر نیک اختر حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تھیں۔

حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک دن میں حضرت جابر بن عبداللہ صحابیٔ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کو گیا۔ اس وقت وہ کپڑا اوڑھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا، پھر پوچھا کہ تو کون ہے؟ میں نے کہا: محمد بن علی بن حسین بن علی ہوں۔ تو انھوں نے میرے ہاتھ چومے اور کہا: اے فرزندِ رسول! مبارک ہو تم کو سلام پیغمبر علیہ السلام کا۔ میں نے کہا: السلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ بعدۂ میں نے قضیہ پوچھا تو انھوں نے بیان کیا کہ مجھے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو ملاقات کرے گا میرے ایک فرزند سے کہ نام اس کا محمد ہوگا، ان سے میرا اسلام کہنا۔ (خزینۃ الاصفیاء، ج1، ص45 واصح التواریخ، ص55)

آپ کا قد میانہ اور رنگ گدم گوں تھا اور صورت وسیرت میں آپ مثل اپنے آبائے کرام کے تھے۔ (مسالک السالکین، ج1، ص214)

صواعق محرقہ میں ہے کہ باقر، بقرالارض سے مشتق ہے اور بقرالارض کے معنی ہیں زمین کو پھاڑ کر اس کی مخفیات کو نکال کر ظاہر کرنے والا، تو آپ نے مخفیاتِ کنز معارف وحقائق واشکال ولطائف کو ظاہر فرمایا، اسی وجہ سے آپ کو باقر کہا گیا۔ (خزینۃ الاصفیاء واصح التواریخ، ص55)

حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سلسلۂ عالیہ قادریہ کے پانچویں امام ہیں۔ آپ طریقت میں دلیل، اربابِ مشاہدہ کے برہان، امام اولادِ نبی، برگزیدہ نسلِ علی ہیں۔ کتابِ الٰہی کے بیان کرتے وقت علوم کی باریکیاں اور لطیف اشارات کو واضح کرنے میں مخصوص تھے۔ آپ کی کرامتیں مشہور اور روشن نشانیاں تابندۂ دلائل سے معروف ہیں۔ صاحبِ ارشاد کا قول ہے کہ: جس قدر علم دین اور سنن، علم قرآن وسیر اور فنونِ ادب وغیرہ آپ سے ظاہر ہوئے وہ کسی سے ظاہر نہیں ہوئے۔ تذکرۃ الخواص الامۃ میں حضرت قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ: میں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا کہ آپ نے حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! میں نے ملاقات کی ہے، اور ان سے ایک مسئلہ دریافت کیا جس کا جواب اتنا شاندار عطا فرمایا کہ اس سے شاندار جواب میں نے کسی سے نہ سنا نہ دیکھا۔

علمائے عصر نے بعض آیاتِ بینات کے معانی ومطالب آپ سے امتحاناً دریافت کیے تو آپ نے ایسے جواب شافی دیئے کہ سوائے مشکل مسائل کے چارہ نہ رہا۔ ایک بار مقامِ عرفات میں تیس ہزار سوالات مختلف مسائل کے آپ سے کیے گئے۔ آپ نے تمام مشکل مسائل کے ایسے شافی جوابات عنایت فرمائے کہ تمام آپ کے فضائل وکمالات کے معترف ہوگئے۔ عطا کہتے ہیں کہ میں نے علمائے کرام کو ازروئے علم کے کسی کے پاس اس قدر اپنے کو چھوٹا سمجھتے ہوئے نہیں دیکھا جیسا کہ آپ کے روبرو۔ ابن شہاب زہری جنھوں نے سب سے پہلے حدیث کی تدوین کی ہے آپ کو حدیث میں ثقہ لکھتے ہیں۔ امام نسائی نے اہلِ مدینہ کے فقہائے تابعین میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ: آپ تابعین اہلِ مدینہ کے تیسرے طبقہ میں سے ہیں اور آپ کے واسطے اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ حضور عالم ما کان وما یکون صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وقت آپ کی ولادت کی پیشین گوئی فرمائی جب کہ آپ کی ولادت بھی نہ ہوئی تھی اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ کو سلام کا حکم فرمایا۔ (اصح التواریخ)

آپ بڑے عابد وزاہد، خاشع، خاضع، پاک طینت اور بزرگ نفس تھے۔ اپنے تمام اوقات کو عبادت وطاعتِ الٰہی سے معمور رکھتے تھے اور آپ کو عارفوں کی سیر ومقامات میں اس قدر رسوخ تھا کہ زبان اس کی صفت سے قاصر ہے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: میرے والد ماجد اکثر آدھی رات گزر جانے کے بعد رویا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت عاجزی سے

فرماتے: اَمَرْتَنِیْ فَلَمْ اَئْتَمِرْ نَھَیْتَنِیْ فَلَمْ اَزْتَجِرْ فَھَا اَنَا عَبْدُکَ بَیْنَ یَدَیْکَ مُقِرٌّ لَا اَعْتَذِرُ یعنی اے میرے پروردگار! تو نے مجھے نیک کاموں کا حکم دیا مگر میں نے اس پر عمل نہیں کیا اور تو نے مجھے برے کاموں سے دور رہنے کو فرمایا مگر باز نہ آیا۔ پس میں تیرا عاجز بندہ تیرے حضور میں اپنے فروگزاشت و گناہوں کا اقرار کرنے والا کھڑا ہے اور کوئی عذر نہیں رکھتا۔ (اصح التواریخ، جامع المناقب، ص223)

آپ بڑے عابد و زاہد اور انتہائی مستجاب الدعوات تھے۔ آپ کے مولا کہتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقر بن علی زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک مرتبہ حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور میں بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ آپ جب مسجد حرام میں داخل ہوئے تو بیت اللہ شریف کو دیکھتے ہی اتنے زور سے روئے کہ چیخیں نکلنے لگیں۔ میں نے کہا حضور! اس قدر زور سے نہ چیخیں کیونکہ تمام لوگوں کی نظریں آپ کی طرف مرکوز ہوگئی ہیں تو آپ نے فرمایا: فَقَالَ لِمَا لَا اَبْکِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ یَنْظُرُ اِلَیَّ بِرَحْمَتِہٖ فَاَفُوْزَبِھَا عِنْدَہٗ غَداً ثُمَّ طَافَ بِالْبَیْتِ وَصَلّٰی خَلْفَ الْاِمَامِ وَرَفَعَ رَأسَہٗ مِنَ السُّجُوْدِ فَاِذَا مَوْضَعُ سُجُوْدِہٖ مُبْتَلٌّ بِدُمُوْعِ عَیْنِہٖ تو فرمایا کہ میں نہ روؤں؟ شاید اللہ تعالیٰ میرے رونے کی وجہ سے مجھ پر رحمت کی نظر فرمائے اور میں کل قیامت کے دن اس کے نزدیک کامیاب ہوجاؤں۔ پھر آپ نے طواف کیا اور مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھی اور جب سجدہ کر کے سر اُٹھایا تو سجدہ کی جگہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

(روض الریاحین، ص56، وراہِ عقیدت، ص364)

آپ کے خاص عقیدت مندوں میں سے ایک روایت کرتے ہیں کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا اور آپ اپنے وظائف و اوراد سے فارغ ہوجاتے تو اونچی آواز میں مناجات شروع کردیتے اور کہتے:

''میرے اللہ! اے میرے مولیٰ! رات آگئی اور دنیا کے تمام حکمرانوں کا تصرف ختم ہوگیا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے۔ دُنیا محوِ خواب ہوکر گویا ناپید ہوگئی۔ لوگوں کا شور و غل سکوت میں بدل گیا۔ آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں تو لوگ بنی اُمیہ کے دروازوں سے بھاگنے لگے اور اپنی خواہشات کو ساتھ لیے واپس ہوئے۔ لیکن اے میرے اللہ! تو زندہ و پائندہ ہے۔ تجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تو سب کچھ دیکھتا ہے۔ غنودگی اور نیند تجھ پر روا نہیں اور جو شخص ان صفات کے باوجود تجھے پہچاننے سے قاصر ہے وہ کسی نعمت کے قابل نہیں۔ اے وہ ذاتِ یکتا کہ کوئی چیز تجھے کسی بھی کام سے روک نہیں سکتی، اور دن رات کو تیری بقا میں خلل انداز ہونے کی مجال نہیں۔ تیری رحمت کے دروازے اس شخص پر کھلے ہیں جو تیرے حضور میں دعا کرتا ہے اور تیری رحمت کے خزانے اس پر نچھاور ہیں جو تیری حمد و ثنا کرے۔ تو وہ مالک و مولیٰ ہے کہ کسی سوال کو رد کرنا تیری شایانِ شان نہیں، جو مومنین تیری بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے دُنیا میں اسے باز رکھنے والا کون ہے؟ انسان تو کیا زمین و آسمان بھی اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے میرے خدا! جب موت، قبر اور یومِ حساب کو یاد کرتا ہوں تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس دنیائے فانی کو دل کی شادمانی کا ذریعہ تصور کروں۔ اعمال نامے کا تصور دُنیا کی کسی بھی دلچسپی میں کیوں کر محو رہنے کی مہلت دے سکتا ہے۔ فرشتۂ موت کو یاد رکھوں تو دل کو دُنیا سے کس طرح لگا سکتا ہوں۔ پس مجھے جو کچھ مانگنا ہے تجھی سے مانگتا ہوں کیونکہ تجھے جانتا ہوں اور میرا ہر مطلب تجھ سے وابستہ ہے کیونکہ تیرے سوا کسی کو پکارتا نہیں ہوں اور تجھ سے میری یہی التجا ہے کہ مجھے وہ موت عطا کر جس میں عذاب نہ ہو اور حساب کے وقت وہ عیش مرحمت فرما کہ جس میں عقوبت و سزا نہ ہو۔''

آپ یہ سب کچھ کہتے اور روتے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک رات میں نے ان سے کہا:

''اے سید اور میرے ماں باپ کے آقا! کہاں تک روئیں گے اور کب تک فریاد و نالہ میں مصروف رہیں گے؟ جواب میں کہنے لگے: اے دوست! حضرت یعقوب علیہ السلام ایک بیٹے کے فراق میں اس قدر روئے کہ آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھے اور آنکھیں سفید ہوگئیں اور میں تو اٹھارہ عزیزوں کو گم کر کے بیٹھا ہوں جن میں میرے پدر بزرگوار یعنی سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر شہدائے کربلا شامل ہیں۔ پھر کیوں کر آہ و زاری میں میں تخفیف کروں۔'' (کشف المحجوب، ص128)

- علمائے شریعت و عرفانِ طریقت دونوں گروہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ اولیائے محدثین و عارفین میں نہایت بابرکت اور سراپا کرامت بزرگ ہیں۔ چنانچہ حدیث کی جس سند میں آپ کا اور آپ کے فرزند اور آپ کے والد ماجد بزرگوار کا ذکر ہے یعنی **جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ علی بن الحسین عن ابیہ الحسین بن علی عن ابیہ علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم** محدثین کا اس سند کے بارے میں یہ قول ہے کہ اگر یہ سند کسی مجنون، پاگل پر پڑھ کر دم کی جائے تو وہ شفایاب ہوکر صاحبِ عقل و فہم ہوجائے گا۔ (مسالک السالکین، ج1، ص214، وخزینۃ الاصفیاء، ج1، ص37، وجامع المناقب، ص219)
- روایت ہے کہ ایک شخص کا بیان ہے کہ ہم لوگ قریب پچاس آدمی

تھے جو حضرت امام محمد باقر بن امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حضور میں حاضر تھے۔ اچانک ایک شخص کوفے سے آیا، جو خرمے کی تجارت کرتا ہے اور اس نے حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف رُخ کر کے کہا کہ فلاں شخص کوفے میں ایسا گمان کرتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک ربانی فرشتہ ہے جو کافر کو مومن سے اور آپ کے دوستوں کے دشمنوں سے جدا کر دیتا ہے اور آپ کو اس کا شناسا کر دیتا ہے؟ اس کی بات کو سن کر حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے پوچھا کہ تیرا پیشہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں گیہوں بیچتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے کہا کہ کبھی کبھی، جو بھی بیچ لیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ایسا بھی نہیں ہے جس کا تم اقرار کر رہے ہو بلکہ تیرا پیشہ چھوارے کے دانے کو بیچنا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کو یہ خبر کس نے دی؟ آپ نے فرمایا کہ ایک ربانی فرشتہ ہے جو مجھے میرے دوست اور دشمن کی خبر دیتا ہے اور سن لے کہ تو فلاں بیماری سے مرے گا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب میں کوفہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت امام محمد زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس بیماری میں اس کی موت کی خبر دی تھی اسی مرض میں اس کی موت ہوئی۔ (ایضا، ص229)

● حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور انھیں دنوں آپ کے والد ماجد حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات پائی تھی۔ داؤد ابن سلیمان اور منصور دوانقی مسجد نبوی میں آئے۔ داؤد تو حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب بیٹھے اور منصور دوانقی دوسری جگہ جا بیٹھے۔ حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ دوانقی میرے سامنے کیوں نہیں آتا؟ داؤد نے کہا کہ حضور انھیں ایک عذر ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دن دور نہیں کہ دوانقی مخلوق خدا پر حکمراں ہو جائے گا۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہوگا۔ اور لمبی عمر پائے گا اور اتنے خزانے جمع کرے گا کہ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہ کیا ہوگا۔ داؤد اٹھے اور یہ خوشخبری دوانقی سے بیان کیا، اس کے بعد دوانقی آپ کے قریب آئے اور آ کر عرض کیا کہ حضور! مجھے آپ کے پاس آنے سے آپ کی عظمت وجلالت نے روکا تھا۔ پھر انھوں نے داؤد کے کہے ہوئے خوشخبری کے متعلق آپ سے دریافت کیا کہ یہ بات میں سن رہا ہوں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو تم نے سنا وہ سچ ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ پھر منصور دوانقی نے پوچھا کہ ہماری حکومت کیا آپ کی حکومت سے پہلے ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں پہلے ہوگی پھر اس نے سوال کیا کہ کیا یہ حکومت مجھ ہی پر ختم ہو جائے گی یا میری اولاد کو بھی ملے گی؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں تمھاری اولاد کو بھی حکومت دراز ہوگی اور تمھارے لڑکے ملک کو حاصل کریں گے اور اس سے اس طرح کھیلیں گے، جس طرح کہ لڑکے گیند سے کھیلتے ہیں اور وہ کہیں گے کہ یہ وہ چیز ہے جو مجھے میرے والد سے پہنچی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ منصور دوانقی کو قدرت نے حکومت دیا اور اپنے ملک کی باگ ڈور جب سنبھالی تو لوگوں کو حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیشن گوئی پر یقین کامل ہوا اور جیسا کہ آپ نے فرمایا ویسا ہی ظہور پذیر ہوا۔ (ایضا، ص229)

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: میرے والد گرامی ایک سال مجلس عام میں بیٹھے تھے کہ: اپنے سر مبارک کو زمین کی طرف جھکایا اور پھر اٹھانے کے بعد ارشاد فرمایا: اے قوم! تمھارا کیا حال ہوگا جب ایک شخص تمھارے اس شہر میں چار ہزار افراد کے ساتھ آ کر تین روز تک قتل و خونریزی کرے گا اور تم ایسے بلا دیکھو گے جس کے دور کرنے کی تم میں طاقت نہ ہوگی اور یہ واقعہ سال آئندہ میں وقوع پذیر ہوگا اس لیے تم اپنے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرلو۔ اور اس بات کو ہوش کے کان سے سن لو کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ ضرور ہوگا۔ اہل مدینہ نے آپ کی بات پر کچھ بھی التفات نہ کیا اور کہا کہ ایسا واقعہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جب وہ سال آیا تو حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے جملہ خاندان و جماعت بنی ہاشم کو ساتھ لے کر مدینہ سے کوچ کر گئے۔ آپ کے چلے جانے بعد نافع بن الارزق چار ہزار فوج لے کر مدینہ میں داخل ہوا اور تین روز تک اس نے مدینہ کو مباح کر دیا اور بے حساب مخلوق خدا کو مارا اور جیسا کہ حضرت نے فرمایا تھا ویسا ہی وقوع پذیر ہوا۔ (تشریف البشر ص66)

● حمیرہ نے کتاب السائل میں تحریر فرمایا ہے کہ: زید بن حازم نے کہا میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھا اتنے میں ان کے بھائی زید بن علی کا گزر ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: دیکھو یہ کوفے میں خروج کرے گا اور لڑے گا اور اس کا سر پھرایا جائے گا۔ چنانچہ جیسا کہ حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیشین گوئی فرمائی تھی ویسا ہی ہوا۔ (تشریف البشر ص68)

● روایت ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ وقت نے آپ کو شہید کرنے کے ارادہ سے ایک شخص کی معرفت بلوایا۔ آپ اس شخص کے ہمراہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے جب بادشاہ وقت کے قریب پہنچے تو وہ آپ سے معافی طلب کرنے لگا اور اظہار معذرت کرتے ہوئے تحائف پیش کیا اور بڑی ہی عزت و احترام کے ساتھ آپ کو واپس کیا۔ لوگوں نے بادشاہ وقت سے دریافت کیا کہ اسے بادشاہ وقت تو انھیں قتل کی غرض سے بلوایا تھا لیکن ہم نے تو اس کے علاوہ سلوک تم کو ان کے ساتھ کرتے ہوئے دیکھا آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا کہ جب حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے قریب تشریف لائے تو میں نے دو بڑے ہی غضبناک شیروں کو

دیکھا جوان کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے اور وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر تم نے حضرت کے ساتھ کوئی بھی گستاخی کی تو ہم تمھیں مار ڈالیں گے۔ (کشف المحجوب ص29)

● روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ دارالعمارت ہشام بن عبدالملک میں تشریف فرما تھے، وہ عمارت بڑی ہی شان و شوکت سے بنی ہوئی تھی۔ اس عمارت کو دیکھ کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ عمارت توڑی جائے گی اور اس کی خاک بھی یہاں سے اٹھالی جائے گی۔ یہ سن کر لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا، مگر جب ہشام کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے ولید نے اس عمارت کو مسمار کر دیا اور جیسا حضرت نے پیشین گوئی فرمائی تھی ویسا ہی ہوا۔ (مرج البحرین ص39)

● حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اولاد امجاد کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں: (1) حضرت ابوعبداللہ (2) حضرت امام جعفر صادق (3) حضرت عبداللہ (4) حضرت ابراہیم (5) حضرت عبداللہ (6) حضرت علی (7) حضرت زینب رضوا اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ (تشریف البشر ص65، انوار صوفیہ 85)

حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سے سرفراز فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: اے بیٹے! جب اللہ تعالیٰ تجھے کوئی نعمت دے تو اس پر **اَلْحَمْدُ لِلّٰہ** کہو۔ اور جب کوئی صدمہ پہنچے تو اس وقت **لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِ الْعَظِیْم** پڑھو۔ اور جب رزق میں تنگی ہو تو **استغفر اللّٰہ** پڑھو۔

ابوسعید منصور بن حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کتاب نشر الدر میں لکھا ہے کہ: امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادے حصرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اے بیٹے! اللہ تعالیٰ نے تین چیز کو تین چیزوں میں چھپا رکھی ہے۔ اوّل اپنی رضامندی کو اپنی فرمانبرداری میں، اس لیے تو اس کے کسی فرمان کو حقیر نہ جانو شاید اس کی خوشی اسی میں ہو۔ دوم اپنے غصّہ کو گناہ میں چھپایا ہے اس لیے تو کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھو، شاید اس کا غصہ اسی چھوٹے سے گناہ میں پوشیدہ ہو۔ سوم اپنے اولیاء کو اپنی تمام مخلوق میں چھپایا ہے اس لیے تو کسی شخص کو ذلیل نہ خیال کر شاید کہ وہ اللہ کا ولی ہو۔

آپ نے فرمایا کہ: بجلی ایماندار اور بے ایمان دونوں پر گرتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے پر نہیں گرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: جس وقت بجلی کی آواز سنو تو پڑھو۔ **اَللّٰھُمَّ لَاتَقتلنا بغضبِ و لاتھلکنا بعذابک** ۔ فرمایا رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس وقت رعد کی گرج سنو تو پڑھو۔ **سُبْحَانَ الذی یسبح الرعد بحمدہٖ و الملٰئکۃُ من خیفتہٖ**۔

فرمایا کہ کوئی عبادت حفاظتِ بطن اور شرم گاہ سے افضل تر نہیں ہے۔

فرمایا کسل و ملامت سے اپنے آپ کو دُور رکھ کیونکہ یہ دونوں ہر ایک برائیوں کی کنجی ہے۔

فرماتے ہیں کہ تو دنیا کو ایک منزل سمجھ کہ وہاں اترے اور کوچ کیے یا وہ مال سمجھ جو خواب میں مل جاتا ہے اور بعد بیداری کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

فرماتے ہیں کہ جب دل میں خدا کا دین خالص داخل ہوتا ہے تو ماسوائے اللہ کو دل سے نکال دیتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ ایمان والے دنیا پر مطمئن نہیں ہوتے اس کے فانی ہونے کی وجہ سے اور آخرت سے بے پرواہ نہیں ہوتے بسبب اس کے ہول کے۔

فرماتے ہیں تو اپنے دین میں جس کا اللہ تعالیٰ نے تجھے نگہبان بنایا ہے اسی اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھ۔

فرماتے ہیں کہ فقر و غنا مومن کے دل میں پھرتے ہیں مگر جب توکل کا ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو وہیں قرار پکڑ لیتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں اپنے والد ماجد کے پاس تھا وصال کے وقت آپ نے غسل و تکفین و دفن اور دخول قبر کے متعلق چند وصال فرمائے۔ میں نے کہا اے والد بزرگوار واللہ جب سے آپ بیمار ہوئے ہیں میں نے آج سے بہتر حالت میں کسی دن نہیں دیکھا اور میں فی الوقت موت کا کوئی اثر آپ پر نہیں دیکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے میرے بیٹے! تو نے حضرت علی بن حسین کو نہیں سنا کہ وہ اس دیوار کے پیچھے سے مجھے پکارتے ہیں کہ اے محمد جلدی کر۔ (مسالک السالکین ج1، ص217 و تشریف البشر ص70۔ جامع المناقب ص323)

آپ نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وصیت کی تھی کہ میں جس کپڑے میں نماز پڑھتا ہوں اسی کا مجھے کفن دیا جائے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غسل دیا اور حسب وصیت اس کپڑے کا آپ کو کفن دیا گیا۔ (جامع المناقب و تشریف البشر)

حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاریخ وصال میں اختلاف ہے۔ مشہور قول کے مطابق آپ کا وصال مبارک ساتویں ذی الحجہ 114ھ بروز دوشنبہ 57 سال کی عمر میں سلطنت ہشام بن عبدالملک اموی کے وقت میں ہوا۔ (مسالک السالکین ج1 ص213)

آپ کا مزارِ مقدس مدینہ منورہ کے عام قبرستان جنۃ البقیع میں (اندرون روضۂ مبارک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے) ہے۔
(مسالک السالکین ج1 ص213)

آپ کا نقش خاتم **رَبِّ لَاتذرنی فرداً** تھا۔ □□

(ماخوذ از' تذکرہ مشائخ قادریہ برکاتیہ رضویہ')

غلام احمد رضا☆

# تکثیری سماج اوراسلامی طرزِ زندگی

## ہندوستانی تناظر میں

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ایسی ہیئت پر فرمائی ہے کہ انسان اپنی ساخت، مزاج ورجحان، ذہن وشعور کی بالیدگی، نفس وجان کی حفاظت، تہذیب و ثقافت کی بہتری، معاش واقتصاد کے استحکام، ضروریات زندگی کی تکمیل، نسل انسانی کے تسلسل اور شخصیت کی نشو ونما کے لیے سماج کا محتاج ہے۔ تمام حیوانات میں انسان ہی واحد ایسا حیوان ہے جس میں تمدن سازی کی صفت ودیعت کی گئی ہے اور یہی تہذیب وتمدن سازی اور سماج کی تشکیل انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ تمدن انسان کی اجتماعی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے اگرچہ تمدن سازی میں انفرادی فکر اور جدت پسندی کا کافی دخل ہوتا ہے لیکن خود انفرادی تخیلات وتخلیقات اجتماعی ماحول کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ تاریخ میں ایسی نظیر نہیں ملتی کہ انسان پیدائش کے وقت سے بغیر سماج کے تنہا زندگی گذارا ہو اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب بھی رہا ہو!

اجتماعی زندگی کے تمام پہلو اپنی اپنی انفرادیت کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط اور منظّم ہیں۔ جس طرح انسانی جسم کے تمام اجزا الگ الگ اہمیت وحیثیت کے حامل ہیں تاہم جسم انسانی ایک ایسی وحدت ہے جس میں ہر عضو کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سماج ایک وحدت ہے جس کا اثر سیاست ومعیشت، صنعت وحرفت اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نمایاں نظر آتا ہے۔

**تکثیری سماج:**

'تکثیری سماج' کا مطلب متفرق علاقے یا مختلف مذہب وملت اور طبقوں کی تہذیب وتمدن کا ایسا سماج ہے جس میں ہر فرد کو اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ماہرین سماجیات کی آرا سے ظاہر ہوتا ہے:

"This is a society in which citizens can legally and publicaly hold multiple competing ethical views and are allowed to choose for themselves what ethical belief if any they wish to hold."

تکثیری سماج ایک ایسا سماج ہے جس میں اس بات کا قانونی حق اور عام رخصت ہو کہ عوام وخواص سب اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔ تکثیری سماج کا اسلام کبھی بھی مخالف نہیں رہا ہے بلکہ تکثیری سماج کو ہمیشہ اسلام کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔

ہندوستان مختلف مذاہب ومسالک، ذات وبرادری، تہذیب وتمدن اور مختلف زبانوں کا ملک ہے۔ یہاں اسلام کے پہنچنے سے قبل مساوات واخوت کا فقدان تھا۔ انسانی آبادی مختلف سماجی گروپوں میں نہ صرف بٹی ہوئی تھی بلکہ ان گروہوں میں طرح طرح کی طبقہ بندی صاف نمایاں تھی۔ سماج کی آبادی مختلف بنیادوں پر اونچے نیچے درجوں میں نہ صرف منقسم تھی بلکہ ان کے درمیان چھوت چھات جیسی بدترین اور مہلک مرض بھی موجود تھا۔ اسلامی تعلیمات کی برکت مسلم درویشوں اور صوفیوں کے اسلامی کردار اور غیر متعصّبانہ تربیت اور مسلم حکمرانوں کے قومی جذبات، مذہبی رواداریاں، ملکی اصلاحات اور سیاسی بصیرتوں سے لوگوں کے قلوب واذہان متاثر ہوئے اور ان کے درمیان سے غیر انسانی رویہ کا خاتمہ ہوا اور طرز زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ ان میں اخوت ومساوات فروغ پایا۔ آج اسی کا اثر ہے کہ ہندوستان اس رنگارنگ تفریق کے باوجود ہندو مسلم سب دوسرے ممالک کے لیے قابل تقلید اور مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف یوں کیا ہے:

''شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور اسلام کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں تھیں یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہائی درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکار کردیا۔ اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی علمی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا خصوصا وہ لوگ جو ہندوستان میں برابری کے حقوق سے محروم تھے اس سے بہت متاثر ہوئے۔''

(تلاش ہند 526-525، ترجمہ Discovery of India)

**غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات:**

اسلام ایک عالم گیر مذہب ہونے کے سبب اپنے اندر ہر دور اور ہر جگہ کے افراد سے ہم آہنگ ہونے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں (صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوگیا) میری ماں جو مشرکہ تھیں مجھ سے ملنے آئیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بتایا کہ وہ مجھ سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں۔ کیا میں ان کے ساتھ تعاون و ہمدردی کرسکتی ہوں آپ نے فرمایا اپنی ماں کے

☆ لوہردگا، جھارکھنڈ

ساتھ صلۂ رحمی کرو۔ (حوالہ مسند احمد)

اس حدیث کی تشریح میں علامہ نووی فرماتے ہیں۔ ''فیه جواز صلة قریب المشرک۔'' (شرح مسلم 84/3) ترجمہ: قریب رشتہ دار مشرک سے صلۂ رحمی اور حسن سلوک جائز و درست ہے۔

ابوداؤد کی روایت ہے: من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ۔ (ابوداؤد۔ کتاب الادب۔ باب فی حق الجوار) ترجمہ: اللہ تعالیٰ اور آخرت پر جس کا ایمان ہو وہ پڑوسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا: جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اپنے پڑوسیوں میں جس کے گھر ضرورت ہو اس میں سے کچھ بھیج دو۔ (مسلم۔ باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ایک یہودی لڑکا رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ جب اس کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عیادت کے لیے اس کے گھر گئے اور اسے قبول اسلام کی تلقین فرمائی۔ وہ یہودی لڑکا مسلمان ہو گیا۔ (بخاری کتاب الجنائز)

ابوطالب والد حضرت علی کی جب وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی کو ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت علی نے دریافت کیا انھیں کون دفن کرے گا وہ مشرک تھا۔ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ دفن کرو اور سیدھے میرے پاس واپس آؤ۔ (ابوداؤد کتاب الجنائز)

قبیلہ بنی ثقیف کا وفد جو ابھی مشرف با سلام نہیں ہوا تھا جب مدینہ میں وارد ہوا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ حضرت خالد بن سعید نے ان کے کھانے کا انتظام کیا۔ (تاریخ ابن ہشام 197/4)

**غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات:**

معاشرہ انسانی زندگی کی ہم آہنگی کا نام ہے اس میں ہندو مسلم، جین، سکھ، عیسائی ہر ایک معاشرہ کے مشترکہ جز ہیں۔ جن کے آپسی تعلقات اور بھائی چارگی معاشرتی زندگی کی ارتقا کے لیے ناگزیر ہے۔

اس لیے غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات، لین دین، تعاون و ہمدردی، ان کے تیار کردہ کپڑے، جوتے اور برتن وغیرہ کے استعمالات، ان کے ماتحت ملازمت کرنا، ان کے تحائف قبول کرنا اور اس طرح کے دیگر معاملات اسلام کے منافی نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں ارشاد فرمایا:

ترجمہ: اہل کتاب کے دئے ہوئے مطعومات (کھانے) مسلمانوں کے لیے کھانا درست ہے اور اسی طرح اہل کتاب کے لیے مسلمانوں کا دیا ہوا کھانا جائز ہے۔ (المائدۃ۔5)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''ان یھودیا دعا النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم الی خبز شعیر واھالۃسخۃ فاجابہ۔'' (بخاری کتاب المغازی۔ السیرۃ النبویہ ابن کثیر 394/3)

ترجمہ: ایک یہودی نے رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانے میں گیہوں کی روٹی اور تیل سے بنا ہوا سامان تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔

حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''فان وجدتم غیر انیتھم فلا یاکلوھا وان لم یجد فاغسلوھا ثم کلوا فیھا۔''

(بخاری کتاب الصید والذبائح)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا غیر مسلموں کے برتن کے علاوہ دوسرے برتن موجود ہوں تو اسی برتن میں کھاؤ اور اگر دوسرا برتن دستیاب نہ ہو سکے تو غیر مسلموں کے برتن کو دھو کر کھانے کے لیے استعمال کرو۔

حضرت امام شافعی اور حضرت علامہ ابن قدامہ باختلاف الفاظ فرماتے ہیں۔ اہل کتاب (غیر مسلم) کے استعمال شدہ کپڑے جیسے عمامہ، چادر وغیرہ جو بدن کے اوپری حصے میں استعمال کیے جاتے ہیں اس کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں، بشرطیکہ اس کے نجس ہونے کا یقین نہ ہو۔

**غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی تعلقات:**

اسلام میں شئی کی حرمت، حلت، اشیائے مبیع کی نوعیت اور بیع وشرا کے طریقے کی صراحت موجود ہے لیکن مکان تجارت یا تاجر کا تعین ہو اس کی مثال نہیں ملتی۔ میدان تجارت کو عام رکھا گیا ہے جس کا مطلب تجارت کہیں اور کسی بھی فرد یا جماعت کے ساتھ کرنا درست ہے اگر مکر و فریب اور دھوکہ نہ ہو۔ تجارت میں ہندو مسلم کی تخصیص نہیں ہے۔ رسول کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں سے خرید و فروخت کرتے تھے۔

حضرت عبد الرحمان بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ بارگاہ نبوی میں حاضر تھے۔ پراگندہ بالوں والا دراز قامت ایک مشرک اپنے کچھ بکریوں کے ساتھ خدمت اقدس میں پہنچا۔ آپ نے پوچھا یہ فروخت کے لیے ہیں یا پھر تحفے کے لیے؟ اس نے کہا فروخت کے لیے آپ نے اس سے ایک بکری خریدی۔ (بخاری کتاب البیوع)

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ ایک بار رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر فاقہ طاری تھا۔ جب اس کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ

عنہ کو پہنچی تو انہوں نے ایک یہودی کے باغ کی سینچائی کر کے سترہ کھجوریں آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ (ابن ماجہ کتاب الرہن)

حافظ ابن حجر ایک حدیث (جو بخاری ومسلم دونوں میں ہے) کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: کفار سے معاملہ کرنا درست ہے بشرطیکہ جس چیز کا معاملہ کیا جارہا ہو وہ حرام نہ ہو۔ اس میں ان کے عقائد کے فساد اور ان کے آپس کے معاملات کے غلط ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(فتح الباری 141/5، عمدۃ القاری 394/1)

جمہور کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی تعلقات جائز ہے۔ البتہ ان کے ماتحت ملازمت کرنے سے متعلق قدرے اختلاف ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس میں مسلمانوں کی توہین ہے۔

لیکن دور حاضر عالمگیریت کا دور ہے۔ اقتصادی معاملات میں مذہب وملت ملحوظ نظر نہیں ہوتی بلکہ منافع مقصد اصلی ہوتا ہے۔ اگر ہم ہندوستانی تناظر میں بات کریں تو یہاں تجارتی میدان میں مذہب ذرہ برابر بھی آڑ نہیں ہے۔ ہر قابل اور صلاحیت مند کے لیے تجارت وملازمت اور نوکری کے مواقع حاصل ہیں۔ مذہب رکاوٹ یا باعث ذلت ورسوائی نہیں۔ اس لیے غیر مسلموں کے ماتحت یا ان کی ملازمت کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ علامہ ابن قدامہ کا بھی یہی موقف ہے۔

### غیر مسلموں سے تعلیمی روابط:

اسلام میں نہ علم کی تخصیص ہے نہ معلم کی تعیین۔ تعلیم وتعلّم کو عام رکھا گیا ہے اور فراست کو مسلمانوں کی گمشدہ پونجی اور دولت کہا گیا ہے۔ علم کے مفید اور مضر اثرات کی وضاحت اور معلم کے اوصاف کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔ لیکن وقت کا یہ بہت بڑا المیہ کہیے کہ بعد کے ذہنوں نے اپنی طرف سے علم کی دینی و دنیوی تقسیم کر کے نہ صرف مخالفین اسلام کے لیے اعتراض کے دروازے کھول دیے بلکہ لاشعوری طور پر اسلامی تعلیمات کے فروغ پر قدغن لگا دیے۔ مدارس کو صرف مسلم بچوں کے لیے خاص کر دیئے جب کہ ہندوستانی معاشرہ اس بات کا زیادہ متقاضی ہے کہ بغیر تفریق مذہب وملت علم کو عام کیا جائے جیسا کہ صوفیائے اسلام اور درویشوں نے کیا۔

اسلام نے تحصیل علم اور فروغ تعلیم پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ حصول علم کے لیے دور و دراز کا سفر اور مشکلات کو برداشت کرنے کی تلقین کی ہے۔ کتمان علم کو حرام اور جہالت کو باعث ضلالت اور تباہی بتایا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ قدیم ہندوستان میں علم وفن پر خاص طبقوں کی اجارہ داری تھی، ہر کس وناکس حصول علم کا مجاز نہ تھا۔ اس پر مستزاد ویدوں کی خفیہ سماعت پر کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بندش اور پابندیاں صرف باشندگان ہند کے لیے تھیں۔ غیر ملکی مستثنیٰ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلامی تعلیمات ونظریات اور افکار کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ جس سے خاص طبقہ کا علم پر برسوں سے چلا آرہا تسلط ختم ہو گیا۔ آج ہندوستان کے تقریباً تمام درسگاہوں میں بغیر تفریق مذہب وملت ہر ایک کے لیے یکساں طور پر علم کا فیضان جاری ہے۔

### غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلقات:

موجودہ مروجہ سیاست جو محض مکر وفریب سے عبارت ہے۔ جس کی مکمل عمارت خالص جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی ہے اس سے قطع نظر سیاست حسنِ تدبیر کا نام ہے۔ جس کا مقصد امن وشانتی کا قیام، مفاد عامہ کی حفاظت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا استحکام، ملک وملت کی تعمیر وترقی، حقوق انسانی کا تحفظ اور انسانیت کی تعلیم ہے۔

اسلام تعاون یا عدم تعاون کا حکم ذات وبرادری، مذہب وملت اور علاقہ وتعلقات کی بنیاد پر نہیں دیتا بلکہ نیکی وبدی، صدق وکذب، نفع ونقصان اور حق وباطل کی بنیاد پر اہل صدق ووفا کی حمایت وتعاون اور اہل کذب وضرر کی ملامت اور اس کی مخالفت کا درس دیتا ہے۔ مدینہ کی ریاست میں یہودی، عیسائی اور منافق موجود تھے۔ ہر ایک کو مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور سیاسی آزادی حاصل تھی۔ ہر ایک کے حقوق تحریری طور پر متعین تھے۔ آپسی تعاون وہمدردی کی عام اجازت تھی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: اور نیکی وتقوی کے کاموں میں مدد کرو اور گناہ وسرکشی کے کاموں میں مدد نہ کرو۔ (سورۃ البقر)

رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**افضل الجهاد كلمة عاد ل عند سلطان جائر**۔'' (مسلم وبخاری) ترجمہ: ظالم حکمراں کے سامنے عدل وانصاف کی بات کہنا افضل ترین جہاد ہے۔

### غیر مسلموں سے عدم تعلقات کی تشریح:

اسلام نے غیر مسلموں سے ایمان وعقیدے اور مذہبی معمولات کے واضح اختلافات کے باوجود ان سے تعلقات قائم کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی جو واضح ہدایات پیش کی ہیں وہ کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ اس کے باوجود اسلام پر غیر مسلموں سے عدم موالات، بے تعلقی اور معرکہ آرائی کے سنگین الزام لگائے جاتے ہیں۔ جس کا اسلام سے دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام ومسلمان کو مٹانے کے لیے ہمہ وقت مشرکین، یہودی، عیسائی اور منافقین اپنے تمام تر اختلافات کو پس پشت ڈال کر کوشاں رہتے تھے۔ اسلام سنگین خطرات سے دوچار تھا۔ ایسے نازک

باقی صفحہ 47 پر

# شیخ اعظم سید شاہ محمد اظہار اشرف کے وصال پر تعزیتی تاثرات

## علامہ سید شاہ محمد اظہار اشرف ایک عظیم علمی وروحانی شخصیت

**محمد ظفرالدین برکاتی**

(مدیر مسئول: ماہنامہ 'کنزالایمان' دہلی)

برصغیر کی عظیم علمی وروحانی شخصیت اور آستانہ عالیہ اشرفیہ حسینیہ سرکارکلاں کچھوچھہ کے سجادہ نشین علامہ سید شاہ محمد اظہار اشرف اشرفی الجیلانی ضلع امبیڈکر نگر میں واقع قدیم روحانی خانقاہ اور تاریک سلطنت سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، علمی اور روحانی حلقوں میں بڑے مقبول تھے۔ موصوف نے نصف صدی تک دعوت وارشاد اور خدمت دین کے فرائض انجام دیے۔ آپ کے انتقال پر پوری دنیا میں ان کے مریدین ومتوسلین میں غم کی لہر دوڑ گئی اور ملک وبیرون ملک سے کثیر تعداد میں لوگ ان کا آخری دیدار کرنے اور نماز جنازہ میں شریک ہونے کے لیے کچھوچھہ آرہے ہیں۔

شیخ اعظم کی پیدائش 6 محرم 1355ھ مطابق 31 مارچ 1936ء کچھوچھہ میں ہوئی۔ خاندانی رواج کے مطابق چار سال چار ماہ کی عمر میں محدث اعظم ہند اور شیخ کے والد ماجد سید مختار اشرف سرکارکلاں نے رسم بسم اللہ خوانی کرائی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے زیر سرپرستی جامع اشرف کچھوچھہ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم دارالعلوم اشرفیہ اہل سنت مصباح العلوم (جامعہ اشرفیہ) مبارکپور اعظم گڑھ میں حاصل کی اور 1959ء میں حافظ ملت، محدث اعظم ہند، سرکارکلاں اور نامور شخصیات کی موجودگی میں موصوف کو دستار وسند فضیلت سے نوازا گیا۔

فراغت کے ابتدائی ایام میں انھوں نے جامع اشرف کچھوچھہ میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا اور رفتہ رفتہ یہاں کے انتظامی امور بھی سنبھالنے لگے۔ انھوں نے دینی وعلمی امور کے ساتھ تنظیمی کاموں کی طرف توجہ دی۔ جس کے نتیجے میں ملک وبیرون ملک میں کئی تنظیمیں، مدارس، مکاتب اور مساجد قائم کیں۔ خاص طور سے ہندوستان میں آل انڈیا علما ومشائخ بورڈ جو پورے ہندوستان میں اپنی الگ شناخت قائم کرچکا ہے، ان کی توجہ کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے افراد سازی کے ساتھ کردار سازی پر بے پناہ توجہ دی۔ اپنے زمانہ تدریس میں انھوں نے طلبہ کی اسی روحانی اور اخلاقی نہج پر تربیت کی جس کا ظاہرہ ہے کہ آج ان کے تلامذہ میں علما، صوفیا اور مشائخ کی ایک لمبی فہرست ہے۔ انھوں نے ملک کے کئی شہروں میں خانقاہیں بھی قائم کی ہیں جہاں تزکیہ قلوب اور روحانیت کا درس جاری ہے۔ تعمیری میدان میں بے پناہ دلچسپی تھی جس کا نتیجہ ہے کہ جامع اشرف، طلبہ ہاسٹل، آستانہ سرکارکلاں، خانقاہ اشرفیہ حسنیہ سرکارکلاں، مسجد اعلیٰ حضرت اشرفی، مختار اشرف لائبریری، مولانا احمد اشرف ہال، سنجیدہ خاندان کوارٹر، نورالعین پارک اور اشرف حسین میوزیم اور ہاسپٹل جیسے عظیم الشان عمارتوں کی جال بچھادی ہے۔

خطابت ان کا موروثی اثاثہ ہے۔ نہایت صاف، سنجیدہ، مدلل اور اثرانگیز لب ولہجہ میں گفتگو فرماتے۔ دعوت وارشاد کے لیے انھوں نے ملک وبیرون ملک کا بے شمار دورہ کیا۔ ملک وبیرون ملک میں ان کے مریدین کی تعداد لاکھوں سے بھی زائد ہے۔ پسماندگان میں صاحبزادی سیدہ زبیدہ کے علاوہ مولانا سید محمود اشرف ناظم اعلی جامع اشرف، مولانا سید محمد اشرف سکریٹری آل انڈیا علما ومشائخ بورڈ، سید حماد اشرف شامل ہیں۔

مورخہ 22 فروری 2012ء/29 ربیع الاول 1433ھ کو آپ کا وصال ہوگیا۔ نماز جنازہ 24 فروری 2012ء کو بعد نماز جمعہ خانقاہ اشرفیہ حسنیہ سرکارکلاں کے وسیع وعریض میدان میں مولانا سید محمود اشرف اشرفی جیلانی ولی عہد وجانشین شیخ اعظم کی امامت میں ادا کی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

ان کے اچانک وصال سے ملت کا جو عظیم نقصان ہوا ہے بظاہر اس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔ بارگاہِ رب کریم میں دعا ہے کہ مولیٰ عزوجل ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور اہل سنت کو اُن کا نعم البدل عطا فرمائے۔

## شیخ اعظم ظاہری وباطنی اوصاف کے سنگم تھے

**مولانا منظر محسن نعیمی**

(امام وخطیب قادری مسجد، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی-25)

راقم الحروف کو بعض ان مجالس میں شرکت کا موقع ملا جن میں شیخ اعظم مدعو ہوتے۔ آپ تقریر وتحریر میں بے نظیر تھے وہ لباس فقر میں اقلیم خطابت کے تاجدار تھے، درخت کی عظمت کا اندازہ اس کے پھل سے کیا جاتا ہے اسی طرح حضرت کی رفعت کا اندازہ ان کی اولاد وامجاد اور ان کے نمایاں تبلیغی، ملی اور سماجی کارکردگیوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ نے اپنے والد ماجد کے نام سے ایک عظیم الشان لائبریری بنام 'مختار اشرف لائبریری' قائم فرمائی۔ ساتھ ہی اعلیٰ حضرت اشرفی مسجد کے نام سے ایک عالیشان و پرشکوہ مسجد کی تعمیر بھی فرمائی اور خانقاہ اور اس سے متعلق اداروں کی تعمیر وترقی کے لیے وہ لازوال کارنامے انجام دیے جو رہتی دنیا تک آپ کی عظمت کی گواہ رہیں گی۔ حضرت شیخ اعظم سرمائے قوم وملت تھے۔ آپ مجمع البحرین تھے۔ اس پیکر گرامی میں علم وعرفان دونوں جمع ہوکر پروان چڑھے اور معراج کمال کو پہنچے۔ آپ کے رشحات فیض وانوار سے ایک زمانہ سیراب ہورہا ہے۔ آپ سند العلما بھی تھے اور تاج العرفا بھی تھے۔ حضرت کے وصال کا مدرسوں اور خانقاہوں دونوں پر یکساں اثر ہے۔ آپ فیضان ظاہری وباطنی دونوں کے سنگم تھے، خلق حسن آپ کا ترکہ ومیراثی حصہ ہے، اپنے اخلاق سے دلوں پر بادشاہت کرتے تھے۔ حضرت بچوں سے بہت زیادہ شفقت ومحبت فرماتے تھے۔ حضرت کا اچانک وصال اہل سنت کے لیے نہایت رنج والم کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ شیخ اعظم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے فیضان سے ہم اہل سنت کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد ظفرالدین برکاتی ☆

# معمارِ ملت مولانا محمد کوثر خاں نعیمی: اِک نظر میں

**تاریخ پیدائش:** ۲۳ رصفر المظفر ۱۳۷۲ھ مطابق یکم نومبر ۱۹۵۳ء بروز اتوار

**والدین کریمین:** عزت مآب نور محمد نعیمی، محترمہ عائشہ خاتون

**برادران گرامی:** برادرِ اکبر محمد مسلم خاں، دوسرے بھائی حافظ محمد عبدالسمیع خاں

**مقام پیدائش:** دارِ عائشہ کاشانۂ نور مدھ نگر بلرامپور، یوپی (گھر کا یہ نام نعیمی صاحب نے رکھا ہے تاکہ والدین کی یاد باقی رہے)

**ابتدائی تعلیم:** دارالعلوم فاروقیہ، مدھ نگر ضلع بلرام پور، یوپی

**ثانوی دینی تعلیم:** جامعہ امدادالعلوم مہٹنا سدھارتھ نگر

**اعلیٰ تعلیم وفراغت:** دارالعلوم انوارالقرآن بلرام پور

**معروف اساتذہ:** حضرت مولانا عبدالرحمٰن رضوی عرف بڑے حضرت، شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی، شیخ القرآن علامہ عبداللہ خاں عزیزی علیہما الرحمۃ والرضوان

**ارادت وخلافت:** حضرت شیخ طریقت مفتی محمد اختصاص الدین نعیمی علیہ الرحمۃ والرضوان۔ **اجازت وخلافت:** مفتی محمد شریف الحق امجدی نائب مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ والرضوان

**تاریخی کارنامے:** (۱) جامعہ عربیہ اظہارالعلوم نیا بازار جہانگیر گنج کی تعمیری اور تعلیمی ترقی (۲) جامعہ عربیہ اظہارالعلوم میں معیاری تعلیمی اور تدریسی نظام اور لائبریری کا قیام (۳) عالی شان وعظیم الشان ''جامع مسجد قادریہ'' کا سنگ بنیاد وتعمیر (۴) پرائمری اسکول اور جونیر ہائی اسکول نسواں کا قیام اور عمارت کی تعمیر (۵) جہانگیر گنج مین روڈ پر ''جامع مسجد غوثیہ'' کی آپ کی سرپرستی میں تعمیر (۶) جہانگیر گنج واطراف میں اشاعت دین متین اور فروغ اسلام وسنیت

**معروف تلامذہ:** حضرت سید شاہ اویس مصطفےٰ واسطی قادری بلگرام شریف، حضرت سید محمد تنویر ہاشمی بیجاپور کرناٹک، مولانا عرش محمد قادری صدر مدرس مدرسہ ادری مئو، مولانا خوش محمد قادری صدر مدرس جامعہ رضویہ شمس العلوم پیرا کنک کشی نگر، مولانا محمد عالم قادری سابق صدر مدرس مدرسہ غوثیہ امدادالعلوم تمکوہی راج کشی نگر، مولانا خلیل اللہ قادری صدر مدرس مدرسہ حشمت العلوم رام پور کٹرہ بارہ بنکی، صوفی کلیم اللہ رضوی صدر مدرس مدرسہ غوثیہ انوارالعلوم ملسی دیوریا، مولانا محمد عمر قادری امام وخطیب نوری مسجد شہر بنگلہ قبرستان کاشی پور کولکاتا، مفتی بدر عالم مصباحی شعبۂ افتاء، مولانا نفیس احمد مصباحی شعبۂ ادب وثقافت، مولانا اختر کمال مصباحی شعبۂ ادب (درس نظامی) جامعہ اشرفیہ مبارک پور، مولانا شکیل احمد برکاتی ومولانا محمد یوسف قادری ومولانا محمد یعقوب نعیمی اساتذہ جامعہ عربیہ اظہارالعلوم جہانگیر گنج۔ مولانا محمد ذاکر حسین رضوی استاذ جامعہ رضویہ شمس العلوم پیرا کنک۔ مولانا حافظ علی احمد رضوی استاذ مدرسہ غوثیہ فیض العلوم میہر وادوہی، مولانا علی امام قادری رام پور کٹرہ بارہ بنکی، مولانا علی امام مصباحی دہلی، مولانا عبدالعزیز نعیمی استاذ مدرسہ فیض نعیمی سریاں اعظم گڑھ، مولانا حبیب الرحمٰن قادری، استاذ مدرسہ منظر حق ٹانڈہ، مولانا محمد افضال قادری ومولانا محمد انوار قادری بسکھاری امبیڈکر نگر، مولانا حافظ شاکر علی رضوی استاد مدرسہ معراج العلوم بدھوخاں دیوریا، مولانا عبدالجلیل رضوی وحافظ طاہر علی ملسی دیوریا، خلیل اللہ قادری مدرسہ رشیدیہ اشاعت العلوم جموان گھاٹ کشی نگر

**ہم سبق وہم عصر:** استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد امام الدین مصطفوی سابق صدر مدرس مدرسہ حشمت العلوم رام پور کٹرہ بارہ بنکی وسابق استاد جامعہ عربیہ اظہار العلوم، حضرت مولانا محمد سلطان صاحب عرف شیخ سلطان جی، مولانا فضل حق قادری نبیرۂ علامہ اعظمی، قاری عبدالرشید رحمانی مصباحی امام وخطیب مینارہ مسجد ممبئی، مولانا عبدالستار مصباحی مقیم حال افریقہ، مفتی حفیظ اللہ خاں نعیمی نائب صدر دارالعلوم فضل رحمانیہ بلرامپور، مولانا قاری شفیق احمد رضوی صدر مدرس دارالعلوم فضل رحمانیہ بلرام پور، ڈاکٹر محبّ الحق قادری شہزادۂ اکبر شارح بخاری، مولانا محمد قطب الدین نعیمی میراج گنج مولانا بیت اللہ نعیمی سابق صدر مدرس دارالعلوم افضل المدارس ملدہ ضلع بلرام پور، مولانا محمد شمیم اختر مصباحی استاد دارالعلوم ندائے حق ٹانڈہ، مولانا محمد رفعت اللہ نعیمی مدھ نگر بلرام پور، مولانا اظہار المصطفیٰ قادری ادروی۔

**خطاب واعزاز:** محبوب العلماء بزبان مبارک حضرت امین ملت سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی، معمارِ ملت بزبان مفتی محمد شریف الحق امجدی

**حج وزیارت:** پہلا حج یکم جون ۱۹۹۱ء ممبئی سے روانگی ہوئی۔ دوسرا حج: ۱۷رجنوری ۲۰۰۱ء ممبئی سے روانگی ہوئی۔ تیسرا حج مع اہلیہ: ۵رنومبر ۲۰۰۷ء لکھنؤ سے روانگی ہوئی۔

**عمر طبعی:** ۵۸ سال ۲ ماہ ۱۴ دن۔ **زمانۂ دریس:** ۳۷، ۳۸ سال

یکم نومبر ۲۰۱۱ء لکھنو میں دل کا آپریشن ہوا۔ دن گزرتے افاقہ ہوتا گیا۔ ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ مطابق ۵ فروری ۲۰۱۲ء کے جلوس عید میلاد النبی میں شرکت کی۔ ۸ر فروری ۲۰۱۲ء کو طبیعت پر علالت چھاگئی تو چھاگئی پھر کاتب تقدیر نے جو لکھا تھا وہ ہوا کہ ۱۳ر فروری ۲۰۱۲ء مطابق ۲۰ر ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ کو معمارِ ملت محبوب العلماء مولانا محمد کوثر خاں نعیمی اپنے مالک حقیقی کو پیارے ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

**پسماندگان:** اہلیہ محترمہ اختر النساء صاحبہ، ایک صاحبزادے، مولانا محمد جیلانی، بہو محترمہ رفیق النسا، تین پوتے محمد حنفی، احمد برکاتی، احمد مجتبیٰ اور ایک پوتی عائشہ صدیقہ۔

---

☆ مدیر مسئول: ماہنامہ 'کنزالایمان' دہلی

محمد عبدالحکیم شرف قادری نقشبندی ☆

# دینی مدارس کے مدرسین

## ذمہ داریاں، مراعات، فرائض اور حقوق

نیا کی ہر قوم تعلیم کی اہمیت کا اعتراف کرتی ہے، سالانہ بجٹ میں اس کے لیے خطیر رقم مختص کی جاتی ہے، خالقِ کائنات جل مجدہٗ نے ابتدائے آفرینش سے انسانیت کی فلاح و بہبود اور ہدایت و رہنمائی کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے اور آخر میں کائنات کے سب سے عظیم معلم، خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، آپ کے بعد صحابۂ کرام، ائمہ دین مجتہدین اور اولیائے کرام اپنے اپنے دور میں اس فریضے کو انجام دیتے رہے، سب کا مقصد عالمِ انسانیت کی بھلائی اور فکر و کردار کو صراط مستقیم پر گامزن کرنا تھا، بالفاظ دیگر انسانوں کو مقام انسانیت سے روشناس کرانا اور اس پر فائز کرنا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ دینی معلّم اور مدرس، وارث انبیا ہے، نائب اولیا ہے اور مسند نشین ائمۂ دین ہے اور دینی تعلیم و تدریس وہ مقدس فریضہ ہے جس کے ذریعہ انسانیت کی عظیم ترین خدمت انجام دی جاتی ہے، معلّمین کے لیے **العلماء ورثۃ الانبیاء** سے بڑھ کر تاجِ عظمت اور تمغۂ فضیلت کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ عزت اور احترام تبھی حاصل ہوسکتا ہے جب ایک استاذ ان آداب کو اپنائے گا جو رہبرِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تابدار سیرت کا حصہ ہیں، اس کے بغیر نہ تو ایک معلم صحیح معنوں میں معلّم کہلانے کا حق دار ہوسکتا ہے اور نہ ہی تسلیم کے مطلوبہ نتائج میسر ہوسکتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا اس پر عمل کر کے دکھایا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: **ان نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کان خلقہ القرآن** (الحدیث)

اس کا مطلب سوائے اس کے کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے ایک ایک حکم پر عمل کر کے دکھایا۔

معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن عقائد اور اعمال کی تعلیم دے گا وہ خود ان کو اپنائے، اگر وہ خود ان عقائد کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہے تو شاگردوں کو وہ قوتِ یقین کیسے فراہم کرے گا؟ اسی طرح جن اعمال کی وہ تعلیم دے رہا ہے اگر خود اس پر عمل پیرا نہیں ہے تو وہ اعمال، طلبہ کی نگاہ میں کس طرح اہمیت حاصل کرسکیں گے؟

اللہ تعالیٰ کی یہ عادت کریمہ ہے اور اقوام عالم بھی اس فرمان کو تسلیم کرتی ہیں کہ تعلیم کے لیے صرف کتاب کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے پڑھانے اور سکھانے کے لیے معلم ہونا چاہیے۔ جو نہ صرف کتاب کی تعلیمات کو طلبہ کے ذہن نشین کرائے، بلکہ وہ خود عمل و کردار کا ایسا حسین پیکر ہو کہ طلبہ اسے آئیڈیل تسلیم کریں اور غیر شعوری طور پر اس کے رنگ میں رنگ جائیں۔ ارشاد ربانی ہے: **قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی** فرما دیجیے کہ میں دین کی تعلیم اور تدریس پر تم سے کچھ معاوضہ طلب نہیں کرتا۔

اس لیے معلم کے لیے ضروری ہے کہ کسی لالچ یا معاوضے کے پیش نظر تعلیم نہ دے، اگر ایسا ہے تو اسے دُکانداری اور کاروبار تو کہہ سکتے ہیں، تعلیم و تدریس کہنا مناسب نہ ہوگا، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بروقتی نہیں ہمہ وقتی تعلیم دی لیکن اس پر فیس اور تنخواہ کا مطالبہ نہیں کیا، معاوضے کی طلب نہیں کی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے اور خلقِ خدا کی بہتری مقصود ہے۔ اگر کچھ طلب کیا تو یہ کہ **الا المورۃ فی القربیٰ**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اے قبائل قریش! تمھارے ساتھ ہماری قرابت ہے اس قرابت کا پاس کرو اس سے محبت کرو اور ہم سے دُور بھاگ کر جہنم کا ایندھن نہ بنو بلکہ اسلام لا کر جنت کے مستحق بن جاؤ یعنی پھر بھی اپنی ذاتی منفعت کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اپیل ہے تو یہ کہ ہمارے پیغام کو اپنا لو اور ہمارے مشن پر گامزن ہو جاؤ۔

مدارس وہ کارخانے ہیں جہاں دین کے ہر شعبے میں کام کرنے والے افراد تیار کیے جاتے ہیں، مدرس، مصنف، مناظر، مبلغ، خطیب، امام اور مفتی ان ہی اداروں میں تیار کیے جاتے ہیں، اور اگر صحیح طور پر ایسے افراد تیار ہو جائیں تو معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا کرسکتے ہیں، ظاہر ہے کہ معلّمی کو بطور پیشہ یا ذریعۂ معاش اختیار کرنے والے مدرسین، فعال اور باصلاحیت علما تیار نہیں کرسکتے۔ یہ کارنامہ وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو اس کام کو بطور مشن اور عبادت انجام دیں گے، جو ہر روز باقاعدہ مطالعہ کر کے اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل کریں گے اور طلبہ کے سامنے مکمل

---

☆ پاکستان

اعتماد اور ذمہ داری سے گفتگو کر سکیں گے۔ ملک المدرسین استاذ العلما حضرت مولانا عطا محمد گولڑوی کو علوم دینیہ پڑھاتے ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے مگر آج بھی وہ ہر کتاب کا مطالعہ کر کے پڑھاتے ہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ جس مدرس کو خود شرح صدر حاصل نہ ہو وہ طالب علم کو علم کی روشنی کہاں سے عطا کرے گا۔

مدرس کی حیثیت ایک باپ کی ہے بلکہ بعض اعتبارات سے تو وہ باپ سے بھی بڑھ کر ہے، اس لیے اس کا رویہ طلبہ کے ساتھ بڑا مشفقانہ اور مربیانہ ہونا چاہیے، طالبِ علم اگر اپنی کسی غلطی پر معذرت پیش کرے تو فراخدلی سے اسے قبول کرے، اور اگر کوئی سوال پوچھے تو اسے تمام تر تسلی کے ساتھ مطمئن کرنے کی کوشش کرے، استاذ کا کام ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو معقول دلائل سے قائل کرے رعب اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے انھیں خاموش کرنے کی کوشش نہ کرے، طلبہ کی اصلاح کے لیے بھی حکیمانہ انداز اختیار کرے اور ایسا طریقہ اختیار نہ کرے کہ طالب علم کی عزت نفس مجروح ہو، ورنہ بہت ممکن ہے کہ باغی اور سرکش خیالات اسے تحصیل علم ہی سے روک دیں اور کسی دوسرے راستے پر چلا دیں۔

درسِ نظامی میں منطق و معقول کی کتابیں اس لیے شامل کی گئی ہیں کہ فکر و نظر کو جلا ملے، حق کی تائید میں استدلال اور غور و فکر کا طریقہ معلوم ہو اور باطل افکار و نظریات کے شکوک و شبہات کا بخوبی ازالہ کرنے کا سلیقہ حاصل ہو جائے۔ان علوم آلیہ کی افادیت تسلیم، لیکن بہتر ہوگا کہ زیادہ زور اصول فقہ پر دیا جائے جس میں معقولیت بھی ہے اور براہِ راست دینی مسائل پر گفتگو بھی ہے، پھر کیا ضروری ہے کہ ایک مدرس تمام زندگی منطق و فلسفہ کے پڑھانے میں ہی صرف کر دے، آلے کو آلے ہی کی حد تک استعمال کرنا چاہیے اسے مقصد کا درجہ دے دینا وضع الشئی فی غیر محله کے ضمن میں آئے گا۔ضروری ہے کہ ایک مدرس کچھ عرصہ علوم آلیہ پڑھانے کے بعد قرآن و حدیث، فقہ اصول فقہ اور علم کلام کے لیے مختص ہو جائے اور اپنی تمام توانائی ان علوم کے لیے صرف کر دے۔

اس جگہ ایک انتہائی اہم بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہمارے علما خصوصاً واعظوں کی تمام تر سعی اور کاوش چند فروعی اور درجۂ استحباب کے مسائل پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے، حالانکہ اصل اہمیت اس پیغام کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے جس پر عمل پیرا ہونے سے تاریخ عالم میں حیرت انگیز انقلاب آ گیا، قیصر و کسریٰ کے تاج شاہی مجاہد صحابہ کی ٹھوکروں پر آ گئے، ہمارے مدرسین کا فرض ہے کہ اپنے شاگردوں کو دین کی اصل روح سے آشنا کریں۔انھیں بتائیں کہ توحید کا ایقان کیا ہے؟ رسالت کا مقام کیا ہے؟ انھیں بتائیں کہ عبودیت کا مطلب کیا ہے؟ لمبے چوڑے نصاب پڑھنے، کئی کئی گھنٹوں پر پھیلی ہوئی تقریریں سننے کا کیا فائدہ؟ اگر خداوند قدوس کے کارساز اور رزّاق مطلق ہونے کا ہمیں یقین نہیں ہے۔اگر ہمارے دل خشیت الٰہی سے معمور نہیں ہیں، اگر ہمیں ایک ایک عمل پر جوابدہ ہونے کا احساس نہیں ہے اگر ہمارے اندر قوتِ عمل بیدار نہیں ہوتی اور اگر مؤذن کی آواز ہمیں عملاً لبیک کہنے پر مجبور نہیں کرتی۔

ایک وقت تھا جب مشائخ تصوف کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھایا کرتے تھے، آج ہمارے نصاب سے تصوف کو خارج کر دیا گیا ہے، ایسے میں ذوقِ عبادت اور جذبہ اطاعت کہاں سے پیدا ہوگا؟ ہمیں احیاء العلوم، کشف المحجوب، الفتح الربانی، رسالہ قشیریہ، ارشاد المسترشدین اور مکتوبات امام ربانی ایسی کتابوں کو شامل درس کرنا پڑے گا۔ورنہ ہم خشک ملا تیار تو کر سکیں گے، ایسے افراد ہرگز تیار نہ کر سکیں گے جن کی گفتگو میں اپیل کرنے والی حلاوت ہو جو تقویٰ وطہارت کے پیکر ہوں اور جن کی نجی محفلیں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذکر اور تعلیمات کے بیان سے آراستہ ہوں۔

ہمارے اساتذہ یونان کے فلاسفہ کے افکار پر مشتمل کتابیں تو پڑھاتے ہیں لیکن ایسی کوئی کتاب نہیں پڑھاتے جس میں ان کی ضلالتوں اور کافرانہ نظریات کی واضح نشاندہی کی گئی ہو، اس مقصد کے لیے امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کا رسالہ مبارکہ الکلمۃ الملہمہ ضرور پڑھانا چاہیے۔

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سیرتوں کا تفصیلی مطالعہ بھی ضرور کرانا چاہیے کہ اس کے بغیر تعمیر سیرت کا تصور باطل ہے۔اولیاء کرام ائمہ مجتہدین اور علماء اہلِ سنت کے تذکروں سے بھی روشناس کرانا ضروری ہے۔

کسی بھی مدرس کے لیے وسیع مطالعہ اور تحقیق ازبس ضروری ہے اور تحقیق کے لیے تصنیف کے میدان میں قدم رکھنا ضروری ہے، تصنیف کے بغیر نہ تو کسی مسئلے پر پوری توجہ مرکوز ہوتی ہے اور نہ ہی کسی موضوع کے ضروری پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، مروّجہ طریقے کے مطابق تفسیر کی کتابیں پڑھانے سے وہ فہم قرآن حاصل نہیں ہو سکتا جو قرآن پاک کی تفسیر لکھنے سے حاصل ہو سکتا ہے، لازماً اس کے لیے مختلف تفاسیر کا مطالعہ پورے انہماک سے کرنا ہوگا اور قدیم و جدید تفاسیر کی ورق گردانی کرنی ہوگی تب کہیں جا کر ایک عالم تفسیر لکھنے کی صلاحیت حاصل کر سکے گا۔

ایک مدرس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کی اخلاقی اصلاح پر بھر پور توجہ دے، تزکیۂ نفس، اتباعِ دین، صبر وشکر، توکل علی اللہ تعالیٰ، غناءِ نفس اور عظمتِ کردار سے روشناس کرائے، تاکہ مدارس سے فارغ ہونے والے علما، عوام کے سامنے اعلیٰ کردار اور عمل کا نمونہ پیش کر سکیں، یہ تسلیم کہ انگریز نے اپنے دورِ حکومت میں عوام الناس کی نظروں میں علما کا وقار گرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ آج کے اکثر علمائے کرام بھی اخلاق، کردار اور عمل کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش نہیں کر سکے جو عوام پر اچھا تاثر چھوڑے۔

مدرس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اجتماعی طور پر درس و تدریس کا فریضہ انجام دے، ورنہ طلبہ کے ساتھ اختلاط اور وہ بھی خاص طور پر تنہائی میں اختیار نہ کرے، طالب علمی کے دور میں دوسرے طلبہ سے بے تکلف میل جول ہوتا ہے، لیکن اب اس سے اجتناب کرنا چاہیے، ورنہ مختلف قسم کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اور کچھ نہیں تو کسی بھی مخالف کو اتہام پردازی کا بہترین موقع مل جائے گا۔ ملک المدرسین حضرت مولانا علامہ عطا محمد بندیالوی مدظلہٗ العالی نے اپنے شاگرد مولانا شاہ محمد صاحب کو ایک جگہ تدریس کے لیے بھیجتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ: ’’درس و تدریس کے علاوہ طلبہ سے الگ تھلگ رہنا، یہاں تک کہ ہو سکے تو اپنے کپڑے بھی خود دھو لینا۔‘‘

کتبِ درسیہ میں موقع کی مناسبت سے طلبہ کو تقابلی مطالعہ کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہیے، اسلام کا تقابل ادیانِ عالم سے، مسلک اہلِ سنت کا تقابل فرقِ باطلہ سے، مذہبِ حنفی کی اہمیت اور برتری دوسرے مذاہب پر اور قرآن پاک کے مختلف تراجم کا تقابلی مطالعہ کرانا چاہیے تاکہ فارغ ہونے والے علما ہر قسم کی معلومات سے بہرہ ور ہوں۔

نیز طلبہ کو اندازِ تبلیغ بھی سکھانا چاہیے، انھیں بتایا جائے کہ وہ اپنے خطاب میں قصّے کہانیوں کا سہارا لینے کی بجائے قرآن و حدیث اور ائمۂ دین کے ارشادات پیش کریں، غیر ضروری اشعار اور وہ بھی ترنّم کے ساتھ پڑھنے سے حتی الامکان اجتناب کریں کہ تعلیم یافتہ طبقہ ان چیزوں کو پسند نہیں کرتا، سامعین کو واقعات سے نہیں دلائل سے قائل کریں، تقریر کا ایک موضوع متعین کریں اور اس پر معقول گفتگو کریں۔ نیز تمام وقت فضائل بیان کرنے پر صرف نہ کریں بلکہ حاضرین کو مسائل سے بھی آگاہ کریں، مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب اس طرح بیان کیے جائیں کہ سننے والوں کو یہ معلوم ہو کہ ان کی سیرت میں ہمارے لیے کیا سبق ہے! واقعہ معراج کو ایک قصّے یا کہانی کے طور پر نہیں بلکہ اس طرح بیان کیا جائے کہ سامعین کو پتا چلے کہ اس میں ہمارے لیے کون کون سے اسباق مضمر ہیں، اسی طرح حضور سید العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت اور آپ کی محبت کی عظمت اس طرح بیان کریں کہ حاضرین یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ ہمیں اس ہادیِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا لازم ہے ورنہ عشق و محبت کا زبانی دعویٰ کوئی حیثیت نہیں رکھے گا۔

مدرس کا یہ کام ہے کہ طلبہ میں تبلیغ کا جذبہ کوٹ کوٹ کو بھر دے۔ خیال فرمائیں کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چچا ابوطالب کے پاس اس کے آخری وقت میں تشریف لے جاتے ہیں، وہاں ابوجہل اور دوسرے مشرکین بھی بیٹھے ہوئے ہیں، آپ نے یہ خیال کیے بغیر کہ یہ لوگ کیا کہیں گے؟ فرمایا: چچا ایک مرتبہ کلمہ پڑھ لو، میں اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمھاری وکالت کروں گا، ابوجہل وغیرہ مشرکین کہتے رہے کہ ابوطالب! کیا تم ملت عبدالمطلب سے برگشتہ ہو جاؤ گے لیکن سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بار بار کلمہ طیبہ پڑھنے کی تلقین فرما کر اپنی ذمہ داری کا حق پورا کر دیا، اسی طرح ایک یہودی بچہ، نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار ہو گیا تو آپ بنفسِ نفیس اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اس کے یہودی باپ کی موجودگی میں فرمایا: بیٹے کلمہ پڑھ کر حیاتِ جاودانی حاصل کر لو، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، اس کے باپ نے کہا اَطِع اباالقاسم، حضور کی بات مان لو، وہ بچہ کلمہ ایمان پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور ایمان پر اس دنیا سے رخصت ہوا، سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری بدولت اسے مستحق نجات بنا دیا، ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تمھاری بدولت ایک شخص کو ہدایت عطا فرما دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

علمِ دین میں ادب کی بڑی اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے تمام فیوض و برکات ادب ہی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں، طلبہ کو یہ نکتہ ذہن نشین کرایا جائے کہ علمِ دین کی برکتیں تب ہی حاصل ہوں گی جبکہ دین سے متعلق رکھنے والی ہر چیز کا ادب اور احترام کیا جائے، استاذ کا ادب، کتابوں کا ادب، دینی درسگاہ کا ادب اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا ادب ہی زینۂ کمال وکامرانی ہے۔ علما اہلِ سنّت کا ادب کیا جائے، ان کی کسی بات یا کسی عمل سے اختلاف ہو تو ان کی توہین و تحقیر کا انداز ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔

دینی مدارس کے طلبا میں کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کا بڑا

رجحان پایا جاتا ہے، اساتذہ اور مدارس کے منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ انھیں سمجھائیں کہ تمھارے والدین نے تمھیں دینی علوم پڑھنے کے لیے بھیجا ہے، دینی مدارس پر خرچ ہونے والی خطیر رقوم، قوم سے دینی علوم کے نام پر حاصل کی جاتی ہیں، اب اگر تم قیام تو مدارس میں کرو اور اپنی ضرورتیں یہیں سے پوری کرو، لیکن اپنا وقت اور اپنی توانائی دنیاوی علوم کے حاصل کرنے پر صرف کرو تو تم نہ صرف اپنی قوم سے بے وفائی کا ارتکاب کر رہے ہو۔ بلکہ تمھیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی جواب دہ ہونا پڑے گا کہ تمھارے پاس دینی علوم کو نظر انداز کر کے دنیاوی علوم کے حاصل کرنے کا کیا جواز تھا؟ جبکہ تم اپنی تمام ضروریات دینی علوم کے حوالے سے حاصل کر رہے تھے۔

طلبہ کو یہ بھی سمجھایا جائے کہ تم پہلے مکمل طور پر دینی علوم پڑھ لو، اس کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرو، تحصیل علم پر پابندی تو نہیں ہے۔

اس طریق کار کے کئی فائدے ہوں گے:

(1) دینی تعلیم حاصل کرنے کی بنا پر ان طلبہ کی بنیاد مضبوط ہوگی تو دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے دوران لادینی نظریات کا مطالعہ کر کے بھٹکنے سے محفوظ رہیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(2) ہر دو طرح کے ماحول میں علم حاصل کرنے سے ان کے ذہنوں میں وسعت پیدا ہوگی اور وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنی تقاضوں سے آشنا ہو کر ان سے مؤثر گفتگو کر سکیں گے۔

(3) قدیم و جدید علوم کے ماہرین نظریاتی کونسل یا کسی بھی ایسے تحقیقی ادارے کے ممبر بن کر یا شریعت کورٹ کے جج یا مشیر بن کر نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے بہتر کوشش کر سکیں گے، ورنہ انگریزی خواں طبقہ انھیں قبول کرنے اور تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکے گا تعاون کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس وقت ایسے علما کی ضرورت ہے جو عصری علوم میں ان کے برابر ہوں اور دینی علوم میں ان سے بڑھ کر ہوں۔

(4) انگریزی زبان میں علوم اسلامیہ کا بہت بڑا ذخیرہ منتقل ہو چکا ہے نئی نئی تحقیقات اور تنقیدات پیش کی جا رہی ہیں، ان ذخائر کا مطالعہ کرنے کے لیے انگریزی زبان کا جاننا بے حد ضروری ہے۔

(5) بین الاقوامی سطح پر تبلیغ اسلام کے لیے قدیم و جدید علوم کے جامع علما مؤثر انداز میں کام کر سکتے ہیں۔

اب آیئے ذرا عوام و خواص کے ذہن میں پیدا ہونے والے ایک سوال پر بھی غور کر لیا جائے، وہ سوال یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے مدارس کی کارکردگی روبہ زوال ہے، ہمارے دینی مدارس سے رازی و غزالی اور احمد رضا بریلوی ایسے علما کیوں نہیں پیدا ہوتے؟ دُور کیوں جائیں جو اساتذہ اس وقت مدارس میں پڑھا رہے ہیں ویسے مدرسین بھی تیار نہیں ہو رہے، یہ معمولی سوال نہیں ہے کہ اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔

ماضی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سلاطین خود دیندار اور علوم دینیہ کے سرپرست ہوتے تھے، دینی مدارس ان کی توجہ خاص کے مرکز ہوتے تھے اور ارباب علم کو نہ صرف معزز اور باوقار مناصب پر فائز کرتے تھے، بلکہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کو انعامات سے نوازتے تھے اور انھیں ان کی ضرورت کے وسائل مہیّا کرتے تھے، اس سے نہ صرف طالب علموں کے ذوق علمی میں بے پناہ اضافہ ہوتا تھا بلکہ امراء، وزراء اور ارباب ثروت بھی اپنے بچوں کو علوم دینیہ حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیتے۔

جب سے انگریزوں نے پاک و ہند میں قدم جمائے انھوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت علوم دینیہ حاصل کرنے والے طلبہ کی حوصلہ شکنی کی، دینی مدرسین کا وقار اور احترام کم بلکہ ختم کرنے کی کوششیں کیں، ایک وقت تھا جب اسکول اور کالج کے پڑھے ہوئے اساتذہ کو پچیس روپے اور مولوی فاضل کو سترہ روپے تنخواہ دی جاتی تھی، اسی طرح حکومت کے کاغذات میں نیچی برادریوں کے خانوں میں جہاں کمّیوں کا اندراج ہوتا تھا وہیں ایک خانے میں مولوی کا اندراج ہوتا تھا۔

آج کے حالات کا جائزہ لیجیے ظاہر ہے کہ حکومت کو دینی مدرسین کی سرپرستی سے کوئی غرض نہیں، عوام الناس کسی واعظ، پیر پروفیسر اور ڈاکٹر کا جس قدر احترام کرتے ہیں اس کا دسواں حصہ بھی مدرس کے لیے روا نہیں رکھتے، منتظمین کی نگاہ میں طلبہ کی جتنی اہمیت ہے مدرسین کی اتنی وقعت بھی نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ طلبہ نہ ہوئے تو مدرسہ نہیں چلے گا، رہا مدرس تو وہ چلا گیا تو کیا؟ دوسرا لے آئیں گے، آپ یہ تو سوچتے ہیں کہ درجۂ عالیہ کی سند حاصل کرنے والے طلبہ کو ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کے برابر درجہ ملنا چاہیے، یہ کیوں نہیں سوچتے کہ مدارس میں اس درجہ کو پڑھانے والے مدرسین کو وہ مشاہرہ اور وہ سہولتیں ملنی چاہئیں جو یونیورسٹی میں ایم.اے عربی کے لیکچرار کو میسر ہیں۔ بلکہ بقول حریری:

ولاترج الود ممن یریٰ. انک محتاجٌ الی قلبه۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ تم اس کے پیسے کے محتاج ہو، اس سے محبت کی توقع نہ رکھو عموماً مدرسین کی خودداری اور عزت نفس بھی محفوظ نہیں ہوتی، ایک

مدرس ساری عمر تدریس میں صرف کر دے اسے رہائش کے لیے ذاتی مکان میسر نہیں ہوتا، اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کہیں امامت و خطابت کے فرائض انجام دینا پڑتے ہیں تو کہیں ٹیوشن پڑھانی پڑتی ہے۔

حضرت صدر الافاضل مولانا سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ بڑے بلند خیال مفکر تھے، آج سے طویل عرصہ پہلے انھوں نے ''مدارس اسلامیہ کے دردناک نظارے'' کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا۔ اس کے بعض اقتباسات، بار خاطر نہ ہوں تو توجہ سے ساعت فرمائیں۔

اسلامیہ مدارس کے شاکی بہت ملیں گے اور ملتے ہیں، مگر ایسے حضرات بہت کم ہوں گے جنھوں نے اپنے دماغ کو ان اسباب کی جستجو میں پریشان کیا ہو۔ جن سے شکایتوں کے مارے تیار ہوتے ہیں۔

دینی درسگاہوں میں علی العموم مدرسین کی کوئی قدر نہیں ہوتی، اور انھیں بسر اوقات کے قابل کفاف میسر نہیں آتا، قلیل تنخواہوں پر صبر کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ دولت مند انھیں منہ نہیں لگاتا، نئے تعلیم یافتہ ان کی صورت کو حیرت ناک تماشا سمجھتے ہیں، ان کی وضع، گفتار، رفتار، خصائل، عادات، سب ان کی نظر میں قابلِ مضحکہ ہیں، ان کی زندگی کے ایک ایک شعبہ پر نکتہ چینی اور حقارت آمیز عیب گیری کی جاتی ہے، قوم کے برتاوے نہایت ناشائستہ، معاش اس قدر تنگ کہ گزارہ بمشکل ہوسکتا ہے، اس خدمت پر نہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا نظر آتا ہے، نہ اپنے ضروریات ہی کی طرف سے اطمینان ہے، باوجود اس کے مردانہ دار استقلال کے ساتھ اپنی خدمت کو انجام دے جانا اور افکار و مصائب کے عساکر و افواج سے سینہ سپر ہونا اپنے بیگانوں کی سختیاں جھیلنا، ہر طرح کی باتیں سننا اور صبر و سکون سے اپنا کام کیے جانا اور کسی کی پرواہ نہ کرنا اسلام کی حقانیت کا ایک اثر ہے اور علوم اسلامیہ کی روحانیت کی زندہ دلیل ہے۔

سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ حاملانِ تعلیم کے دماغوں کو فکر نان و نمک کی قیدوں سے آزاد کیا جائے اور اہل و عیال کی بدحالی کے غموں سے رہائی دے دی جائے تاکہ وہ فارغ زندگی بسر کرسکیں اور دماغی قوی سے آزاد ہو کر کارِ تعلیم کے لیے وقف ہو جائیں۔ اس وقت تعلیم کا لطف آسکتا ہے اور سربراہان کارانِ تعلیم اپنے فضل و کمال کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ طلبہ متوسط درجے کی انسانی زندگی سے گرے ہوئے نہ ہوں، بھوکا استاد کیا دماغ سے کام لے سکتا ہے؟ گرسنہ شاگرد کیا اخذ مطالب کرسکتا ہے؟ یہاں استاد بھی پریشان حال ہیں اور شاگرد بھی، ان طلبہ کو یہ بھی امید نہیں ہے کہ کسی اگلے زمانے میں ان کو یہ محنتیں کام دیں گی اور ان کے عیش و راحت کا ذریعہ ہوسکیں گی، ان کے استاد ان کے سامنے نمونہ ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ اگر ہم نے جان ہلاک کر کے محنتیں جھیل کر کے استاد جیسا کمال پیدا کر لیا اور نصیب یاور ہوا اور بالفرض کہیں مدرسی مل گئی تو ہمیں کار آزما اور مشاق ہو جانے کے بعد پھر ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جن کے شکنجے میں حضرت استاد مدظلہ پھنسے ہوئے ہیں، یہ ایسے حوصلہ فرسا اور ہمّت شکن حالات ہیں۔ ان کے باوجود عزم و استقلال کو پایۂ ثبات سے محروم رہنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

مدارس اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ اساتذہ کی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر اتنا کفاف مقرر کریں جو ان کے دماغوں کو معاش اور ضروریاتِ زندگی کی افکار سے آشنا نہ ہونے دے، طلبہ کے لیے ایسے وظائف مقرر ہوں کہ وہ معمولی درجے کے انسان کی زندگی بسر کرسکیں لیکن اسلامی مدارس یہ دونوں فرض انجام نہیں دیتے۔ حقیقت میں جان سکتا ہے کہ قوم نے آنکھیں پھیر لی ہیں، مسلمانوں کی توجہ کا رُخ پھر گیا ہے

ادھر سے ادھر پھر گیا رُخ ہوا کا

دنیا ان مدارس کو غیر ضروری اور بیکار چیز شمار کرتی ہے، زمانہ چاہتا ہے کہ علما اور طلبہ کھانے پینے کے حق میں فرشتہ خصال ہو جائیں وہ آمدنی جس کا مصرف یہی مدارس ہیں دوسرے کاموں میں صرف کی جاتی ہے اور مستحق محروم چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مدرسوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا جس سے وہ اپنی حالت درست کرسکیں، مدارس کو موجودہ قلیل تنخواہوں کا ادا کرنا دشوار ہے، مسلمان اس طرف سے بہت افسر وہ خاطری برتتے ہیں، چندے بہت قلیل ہیں اور وہ بھی وقت پر نہیں پہنچتے۔

(پھر خیریت ہے کہ) شکم سیر، بے فکروں کو شکایت ہے کہ ان مدارس میں گداگری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، مگر یہ شکایت کرتے ہوئے ان کو غیرت آنا چاہیے کہ انھوں نے مذہب و دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے والوں کو کس حالت میں رکھا ہے، کیا کسی مدرسہ کو آج یہ ثروت حاصل ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو انگریزی اسکولوں کے بورڈوں کی حیثیت میں رکھ سکے؟ طلبہ کی اولوالعزی اور مردانگی صد ہزار آفریں کی مستحق ہے کہ وہ باوجود ان مصائب کے طلب علم میں محو ہیں۔

(ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور، انڈیا ص13-11)

اس طویل اقتباس کو ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے پڑھیے اور غور کیجیے کہ حضرت صدر الافاضل نے کس گہری نظر سے دینی مدارس کے حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ ☐☐

# عہد جدید میں مطالعۂ سیرت النبی ﷺ

پروفیسر سید عبدالرحمٰن شاہ بخاری ☆

**مطالعۂ سیرت نفس نفس آگہی سے جینا سکھائے:**

انسان آج کل جس انداز کی زندگی گزار رہا ہے رفتہ رفتہ وہ اس کے لیے اپنی معنویت اور کشش کھونے لگی ہے۔ اس میں وضعیت (بناوٹ) اُبھر آئی ہے۔ ایک ٹھہراؤ اور جماؤ، ایک تقشّف اور ظاہرداری۔ کہنے کو آدمی جی تو رہا ہے مگر جینے کے لطف سے محروم۔ وہ دین پر عمل تو کر رہا ہے لیکن دین کی روح سے عاری۔ بس ایک جینا۔ بدل دیں اپنا وضعی و بناوٹی طرزِ حیات۔ ڈھل جائیں ایک نئے وجود میں۔ سنوار لیں اپنی زندگی۔ سدھار لیں اپنا ظاہر و باطن۔ لیکن کیسے؟ دین ہمارے جذبوں میں کیوں کہ اُترے اور عمل میں کیسے ڈھلے؟ یہی اس عہد کا سب سے بڑا سوال ہے، اور اس کا جواب ہمیں رب ذوالجلال کی بارگاہ سے یہ ملتا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (احزاب: 21)

یعنی بے شک تمھارے لیے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: اے مسلمانو! زندگی میں جو چھوٹا بڑا عمل بھی کرو، اسے ہو بہو میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کے مطابق انجام دو۔ زندگی گزارنے کے طریقے بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو طریقہ خدا کو سب سے زیادہ پسند تھا وہ طریقہ اس نے اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سکھا دیا اور ہمیں کہا کہ جو کوئی خدا کے پسندیدہ طریقے سے جینا چاہتا ہے وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی اختیار کر لے۔ خدا کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت پیاری ہے۔ اور وہ سب دنیا والوں کو سنت کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں۔ ہر عمل، ہر حال میں، سونے جاگنے میں، گویائی خاموشی میں، چلنے ٹھہرنے میں، اُٹھنے بیٹھنے، غرض ہر نفس، ہر لحظہ، ہر قدم، ہر سانس پوری دنیا خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پاکیزہ اداؤں کی پیروی میں لگی رہے۔ یہی انسان کا مقصدِ حیات ہے۔ یہی خدا کی مرضی اور یہی اس کا حکم۔ اسی کا نام شریعت ہے اور اسی کا نام دین۔ سچ کہا ہے شاعر نے:

اسلام کیا ہے ، تیری اداؤں کا نام
قرآن کیا ہے، تیری ثنا سر سے پاؤں تک

اتباعِ سنت ہمارے دین کا سب سے پہلا تقاضا بھی ہے اور ہماری شخصیت کی تعمیر کا سب سے بڑا ذریعہ بھی۔ انسانی وجود کے سارے بگاڑ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی ہی سے مٹتے ہیں۔ اتباعِ سنت سے انسان کی عادات واطوار کے لیے ایک سانچہ مہیا ہو جاتا ہے اور ہر شخص ایسی زندگی بسر کرتا ہے جس میں شعور کار فرما ہے، بیداری جلوہ گر ہے اور ضبطِ نفس نمایاں ہے۔ وہ کام اور وہ اعمال جن کی تہہ میں کوئی قاعدہ، ترتیب اور نظم وضبط نہ پایا جائے، فکر و عمل کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ان سے قلب و روح کا ارتکاز تباہ ہو جاتا ہے اور انسان اس قابل نہیں رہتا کہ ان صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر مجتمع کر سکے۔ اس لیے ہم جو قدم بھی اُٹھائیں اور جو کام بھی کریں اسے ہمارے شعور و ارادے کے مطابق اور نظم و ترتیب کا پابند ہونا چاہیے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے فکر و شعور کی سب موجوں اور قول و عمل کی تمام جنبشوں کا محاسبہ اور نگرانی کرنا نہ سیکھیں۔ اس محاسبہ وضبطِ نفس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اپنے روز مرّہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کا خیال رکھیں۔ اس طرح مسلسل محاسبہ، ضبطِ نفس اور پیہم نگرانی کے ذریعے ہمارے ذہن ودماغ اور فکر و شعور ہمیشہ بیدار رہتے ہیں۔

بظاہر اس بات میں کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم کس ہاتھ سے کھاتے ہیں، کس کروٹ سوتے ہیں، اور کس طرح چلتے ہیں، لیکن اگر ہمارے اعمال میں ایک تنظیم رونما ہے اور ہم ایک خاص سانچے میں اپنی عادات کو ڈھالنے کے عادی ہیں تو چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت اور تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے۔ مسلسل ضابطہ وترتیب کا خیال رکھنا اور ہمیشہ اپنے آپ کو قواعد و پابندیوں میں بندھا ہوا محسوس کرنا انسان کی ذہنی وجسمانی کسل مندی اور غفلت و بے التفاتی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ جب ہم اس طرح

مسلسل مشق وتمرین سے اپنے تمام اعمال وتصرفات کو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سانچے میں ڈھال دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے نفس وشعور میں ضبط وانقیاد کے وداعی راسخ ہو جائیں گے۔ زندگی کا یہ پہلو طبیعتِ ثانیہ بن جائے گا۔ ہم فکری وعملی کسل مندیوں سے نجات پالیں گے اور ادب واخلاق کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہو جائیں گے۔

اس ضمن میں انتہائی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اتباعِ سنت پر مبنی اعمال کی تہہ میں شعور وادراک اور ارادہ واحساس کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہنا چاہیے کیونکہ اگر سنت کے مطابق عمل اس سطح پر آ گرے کہ ہماری تمام زندگی میکانکی ہو کر رہ جائے اور بے جان مشینری کی طرح اوامر ونواہی پر عمل کا تسلسل جاری رہے تو اس کا یہ معنی ہوگا کہ سنت نے اپنی قدر وقیمت کھو دی اور اس کی روح ختم ہوگئی جبکہ روحِ سنت کی پیروی ہی عمل کا مقصودِ اصلی ہے۔

سنت جیسا کہ مغرب زدہ معاندین اسلام سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کی کوششوں سے ہم تک نہیں پہنچی جو فریسیوں کی طرح محض الفاظ پرست اور جامد مطلق ہوں بلکہ یہ ان لوگوں کی مساعی جمیل کا نتیجہ ہے جو بلا کا شعور رکھتے تھے۔ جن میں غضب کی عزیمت اور گہری بصیرت کے ساتھ عمل کے پرجوش دواعی موجزن تھے۔ اس کا صحیح اندازہ صحابۂ کرام کی ذواتِ مقدسہ سے ہوتا ہے۔ انھوں نے پورے شعور وادراک سے مالا مال ہو کر اور کامل عزم وارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو ایک ہادی ورہنما کے سپرد کر دیا تھا تا کہ وہ ان کے اعمال کو اپنی پاکیزہ سیرت وسنت کے سانچے میں ڈھال دے۔ ان کا ذہنی شعور ہمیشہ زندہ رہا۔ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک ایک جز میں جو حکمتِ عمل پوشیدہ ہے وہ اس سے پوری طرح باخبر رہے اور کامل شعور واحساس کے ساتھ اتباعِ سنت کے جادۂ نور پر گامزن رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سنت کی پیروی سے تاریخ میں لازوال فوائد اور بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔

سنتِ مطہرہ کی پیروی اللہ تعالیٰ ہم سے صرف اور صرف اس لیے چاہتا ہے کہ ہم جو عمل بھی کریں اور جس حالت میں بھی ہوں ہر وقت، ہر آن، ہر نفس، ہر سانس محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یاد میں ڈوبے رہیں۔ خدا کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعمال وافعال کی مجرد نقل نہیں چاہیے، اصل مقصود ان اعمال کی انجام دہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف توجہ دھیان اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تصور کی حرارت ہے۔ ہم پانی پئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یاد کریں۔ کھانا کھائیں تو اُن کی طرف توجہ رہے۔ بیٹھیں تو انھیں دیکھیں۔ اُٹھیں تو انھیں سوچیں۔ گفتگو کسی سے ہو اُن کی طرف دھیان رہے۔ سوئیں تو اُن کے تصور میں اور جاگیں تو دل اُن کی محبت میں ڈوبا ہو۔ یہی اتباعِ سنت اور یہی ہے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور عشق واتباع کی حرارت کا نام ایمان ہے۔

زندگی کچھ نہیں، تیری اطاعت کے بغیر
اور بے روح اطاعت ہے، محبت کے بغیر

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے محض عادتاً میکانکی انداز میں سنت کی پیروی کرنے کی بجائے جیتی جاگتی، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ڈوبی ہوئی اور تصورِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حرارت سے بھری ہوئی اتباعِ سنت کے پیکر بن جائیں۔ ایسی اتباع جو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹے۔ جذبوں کی ساری تپش جس میں گندھی ہوئی ہو۔ یادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ولولے جس میں انگڑائیاں لے رہے ہوں اور جو ہمارے وجود کے روئیں روئیں میں بجلیاں سی بھر دے۔ یہ منزل اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پہلے ہی دن میسر نہیں آ جاتی۔ اس کے لیے پیہم ریاضت اور مسلسل مجاہدہ درکار۔ یہ مجاہدہ عملی بھی ہوگا، ذہنی اور جذباتی بھی۔ عملی مجاہدہ تا مسلسل اتباع کا نام ہے اور ذہنی وجذباتی ریاضت پیہم مطالعۂ سیرت سے عبارت ہے۔

مطالعۂ سیرت لگاتار جاری رہے تو اثر پذیری دن بہ دن بڑھتی چلی جاتی ہے تا آنکہ عمل کی ظاہری سطحوں سے لے کر وجود کی داخلی پہنائیوں تک پہ ایک ہی چھاپ لگ جاتی ہے، اسوۂ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی چھاپ۔ مطالعۂ سیرت انسان کے وجود سے کاہی کھرچ کر نکال دیتا ہے اور اس کی جگہ تازگی، بیداری اور نشاط سارے بدن میں اُنڈیل دیتا ہے۔ سیرتِ طیبہ کا مطالعہ خود ایک فعالیت ہے اور زندگی کے ہر گوشے، ہر رُوپ میں فعالیت بھر دیتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں دنیا بھر کے نفسی، کرداری اور روحانی علوم مل کر انسان میں ارتکازِ توجہ (Concentration) اعتماد (Confidence) اور ماورائی مراقبہ (Transcendental meditation) کی اس قدر عملی قوت، ریاضت اور فعالیت پیدا نہیں کر سکتے، جس قدر تنہا مطالعۂ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک ہی عمل اسے تمام صلاحیتوں سے بہرہ ور کر دیتا ہے۔ (جاری)

مولانا قدیر اختر ندوی☆

# مسلمانوں کی تاریخ نگاری

تاریخ دنیا کے اہم ترین علوم میں سے ہے، یہ حالات و واقعات کے منتشر اجزا کا وہ مجموعہ ہے جس کی ترتیب طبعی وقدرتی ردعمل کے طور پر ہوا کرتی ہے، تہذیب وثقافت کی تعمیر میں اس کا کردار بہت اہم ہوا کرتا ہے، اس لیے دنیا کی ہر متمدن قوم اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے۔ یہ تاریخ اس کی زندہ روایات اور شاندار ماضی کا عکس بردار ہوا کرتی ہے اور باحوصلہ انسانوں کو دعوت دیتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مؤلف تو خود زمانہ ہوتا ہے۔ مگر اس کی تاریخ 'بے حرف وصوت' ہوتی ہے کبھی قومیں اپنی تاریخ آپ مرتب کیا کرتی ہیں۔ اپنی سعی پیہم کی داستانیں اور اپنے سوز وتپش کی کہانیاں خود کہتی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تاریخ کی عظمت کا انحصار خود قوموں کے عمل اور محورِ عمل کی وسعت وعظمت پر ہے۔

تاریخ کا موضوع خود انسان ہے اور ایک انسان یا ایک قوم کے کارنامے بسا اوقات صدیوں پر محیط ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے اس ایک انسان یا ایک قوم کی تاریخ دراصل پوری کائنات کی تاریخ ہوجاتی ہے۔

آج سے چند صدی پہلے مسلمانوں کی حیثیت اس عالم کی روح رواں اور نبض دوراں کی تھی، ان کی اجتماعی وعمرانی زندگی کے ارتقائی عہد کی شام وسحر صدیوں اور قرنوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے ذوق وشوق نے علم وفن کی بے شمار محفلیں آراستہ کی ہیں اور تہذیب عالم کو نئے نئے علوم وفنون سے روشناس کرایا ہے۔ جہاں سے ان کی تاریخ شروع ہوتی ہے وہ خطّہ 'خامہ وقرطاس' کی دنیا سے ناآشنا تھا۔ اس لیے پہلی صدی میں باقاعدہ تاریخ نگاری کا ثبوت نہیں ملتا۔ مگر چند شواہد ایسے ضرور ملتے ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ابتداء ہی میں دنیا کی تاریخ ازسرنو مرتب کرنے کا تہیّہ کرچکے تھے حضارت مدنیت کی نعمتوں سے محرومی کے باوجود اپنی نشاۃ وبیداری کی ابتدا ہی میں انھوں نے اپنی تاریخ کا ایسا وقیع سرمایہ پیش کیا ہے جس کی مثال اقوام عالم میں کہیں اور نہیں ملتی۔

ابتداءً ان کی تاریخ نگاری سیر و وقائع تک محدود رہی۔ چونکہ ان کے نزدیک شخصی کردار کے حقیقی خدوخال کی وضاحت جنگوں میں ہوا کرتی ہے اس لیے ان کی توجہ صرف مغازی تک رہی، یوں اہل علم حضرات سے یہ بات مخفی نہیں کہ تدوین حدیث درحقیقت سیرت نگاری ہی کی کوشش تھی۔

کشف الظنون کے مصنف کا کہنا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک مغازی وسیرت کی روایات جمع کرنے کی علیحدہ علیحدہ کوششیں شروع ہوچکی تھیں اور مختلف مرکزی مقامات میں عروہ بن زبیر، وہب بن منبہ، عاصم بن عمر، موسیٰ بن عقبہ، ہشام بن عروہ بن زبیر کی نگرانی میں کام بڑی سرگرمی سے ہو رہا تھا۔

مگر تاریخ وسوانح کے شعبہ میں ایسی کتاب جسے ہم باقاعدہ تصنیف کہہ سکیں، ہمیں دوسری صدی ہجری کے وسط میں ملتی ہے جبکہ عرب وعجم کا تہذیب اختلاط وامتزاج ہوا، جیسا کہ ابتداءً عرض کیا جاچکا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ نگاری پہلے سیرت ومغازی ہی تک محدود رہی۔ ابن اسحاق نے سب سے پہلے سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

**ابن ھشام:**

ابن اسحاق کی وفات خلیفہ منصور کے عہد میں ہوئی، اسی کتاب کو ابن ہشام نے اضافہ وتنقیح کے ساتھ دوبارہ مرتب کیا اور سیرت کے مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی، جو کتاب سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے وہ دراصل ابن اسحاق ہی کی کتاب کا نقش ثانی ہے۔

**واقدی:**

ابن اسحاق کے بعد مشہور مؤرخ کی حیثیت سے واقدی کا نام آتا ہے۔ واقدی محدثین کے نزدیک جو درجہ بھی رکھتے ہوں، مگر ابن سعد کے استاد اور مغازی کی روایات کے امام مانے جاتے ہیں۔ کتاب المغازی ان کی بہترین تصنیف ہے جس میں قرن اولیٰ کی تمام جنگوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

**بلاذری:**

تاریخ نگاری دراصل بلاذری سے شروع ہوتی ہے جس نے 892ء میں فتوح البلدان کے نام سے اقوام وممالک کے حالات تفصیل سے پہلی بار پیش کیے۔ فتوح البلدان اگرچہ تاریخ کی پہلی کتاب ہے مگر اعلیٰ درجہ کے مؤرخانہ شعور کا مظہر ہے۔

**دینوری:**

اسی عہد میں ایک طویل تاریخ دینوری نے اخبار الطّوال کے نام سے لکھی، مگر دونوں کے معیار میں بہت فرق ہے۔ فتوح البلدان میں واقعات وتفصیلات کی ترتیب مؤرخانہ ہے اور اخبار الطّوال میں داستاں سرائی سے کام لیا گیا ہے۔

**یعقوبی:**

بلاذری کے بعد مؤرخین عالم میں خصوصی اہمیت یعقوبی کو حاصل ہے، یعقوبی نے تشیع کے باوجود ایسی تاریخ لکھی ہے کہ جس میں دیانت اور تاریخ

☆کراچی، پاکستان

نگاری دونوں کے تقاضے بڑی خوبی سے پورے ہوئے ہیں۔یعقوبی کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نشان و معیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلاذری کی فتوح البلدان میں مسلمانوں کی تاریخ نگاری کا دائرہ پہلی بار وسعتوں اور بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آیا۔مگر تفرد و امتیاز کی گنجائش اب بھی باقی تھی کیونکہ مؤرخانہ عظمت واقعات کے بیان سے نہیں بلکہ اندازِ بیان سے جھلکتی ہے۔فکر و نظر کی وسعتوں سے انداز بیان، نفس واقعہ کی یکسانی کے باوجود یکسر بدل جاتا ہے۔ایک عظیم ترین مؤرخ کو صرف حالات و واقعات ہی کے علم کی ضرورت نہیں بلکہ واقعات کے اسباب و محرکات وسیع ترین نتائج اور ان جزئیات کے علم کی ضرورت ہے جو قوموں کے مزاج اور کلچر کے ترکیبی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تا کہ قوموں کے عروج و زوال کے تمام گوشے روشن اور نمایاں ہوجائیں۔ اس مؤرخانہ عظمت کے لیے ذہن کی وسعت اور عمیق ترین مطالعہ کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربات و شواہد کی بھی ضرورت ہے،ایک مؤرخ کے ذاتی سرمایۂ معلومات کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔اس کی ذاتی معلومات کا ذخیرہ اس کی تصنیف کے معیار کو بلند سے بلند تر،اور واقعات کے خلا کو پُر کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

**طبری:**

تیسری صدی ہجری میں علاّمہ ابن جریر طبری نے تاریخ کی ایک ایسی کتاب لکھی جو مؤرخانہ ذہن کے ارتقاء اور تاریخی و تمدنی حقائق سے مکمل شعور و آگہی کی بہترین مثال ہے۔

علامہ طبری نے طبرستان کے کوہستانی علاقے میں ہوش کی آنکھیں کھولیں،اور تحصیل علم کے لیے براہِ راست بغداد کا سفر کیا۔فراغ کے بعد مصر و شام اور دیگر ممالک کی سیاحت کی،اپنی علمی بصیرت اور ہمہ گیر علمی ذوق کی بنا پر متوکل کے وزیر یحییٰ بن عبداللہ کے اتالیق رہے۔ زندگی کی ان ساری بلندیوں اور رفعتوں تک محض 23 برس کی عمر میں پہنچے،مگر طبیعت کی افتادان پابندیوں کو کب گوارا کرسکتی تھی، کچھ دنوں کے بعد نامعلوم اسباب کی بنا پر اس مشغلہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر لکھنی شروع کی،ان کی تفسیر نگاری بھی دوسروں سے قطعاً مختلف تھی، تحقیق کا اندازہ اور روح معانی تک رسائی کی کوششیں نئے انداز سے کی گئی تھیں۔تفسیر کے بعد انھوں نے ایک وسیع،طویل اور قیمتی سلسلۂ تصنیف کا آغاز کیا،اور اس طویل مدت کے بعد تاریخ الرسل والملوک کے نام سے ایک ایسی کتاب پیش کی جس نے ہمارے تاریخی سرمایہ کو لائق صد افتخار بنا دیا۔

طبری کی تاریخ میں واقعات و سنین کے اندراج کے سلسلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔اور ایسی قیمتی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں کہ تاریخ کے دوسرے صفحات خالی نظر آتے ہیں۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہر اہم اور غیر معمولی واقعہ کسی نہ کسی عینی شاہد کی وساطت سے بیان کیا گیا ہے۔اسی لیے طبری کی تاریخی روایتیں زیادہ قابل استناد سمجھی جاتی ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ محدثانہ طرز تھا۔مگر واقعات کی صحت کا اس سے زیادہ اہتمام ایک مؤرخ کیا کرسکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعات کی ترتیب میں تاریخی تسلسل باقی نہیں رہا۔اسی لیے یورپ کے مؤرخین اس کے بلند ترین معیار کا اعتراف کرتے ہوئے اس محدثانہ طرز کو تاریخ کا سب سے بڑا نقص قرار دیتے ہیں۔

**مسعودی:**

اہلِ یورپ تاریخ طبری کو تفصیلات و جزئیات کا قیمتی ذخیرہ سمجھتے ہوئے مسعودی کی تاریخ کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔مسعودی نے اپنی تاریخ میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ اس کے ذاتی مشاہدات کی حیثیت رکھتے ہیں مسعودی نے ایشیا کے بیشتر علاقوں کی سیاحت کی تھی اور آرمینیا، ہندوستان و چین کا بھی سفر کیا تھا۔سیاحت کے بعد اپنی بقیہ زندگی شام میں بسر کی،اور وہیں ''مروّج الذہب'' کی تصنیف شروع کی۔مسعودی کو اپنے پیش رو مؤرخین سے یہ شکایت تھی کہ ان کی معلومات کا سارا ذخیرہ کتابوں کے مطالعہ کا رہینِ منّت ہے،اس لیے وہ اس مؤرخ کے ہمسر کبھی نہیں ہوسکتے جنھوں نے اپنی ساری عمر تاریخ اور آثار و علائم کی تلاش و جستجو میں صرف کی۔کائنات کی تہوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور معارف کے گنجینۂ مخفی تک رسائی حاصل کی۔(مروج الذہب،صفحہ:۹)

دراصل یہی احساس محرک تھا مسعودی کی اس تصنیف کا جو عربی ادب کے ماتھے کا ستارہ اور فن تاریخ کا شاہکار ہے۔ابن خلدون جس نے دنیا کو پہلی بار تاریخ نگاری کے اصول سے آشنا کیا۔مسعودی کو امام المورخین کہتا ہے۔ مسعودی نے پہلی بار بتایا کہ مؤرخ کا نقاد ہونا ضروری ہے۔طبری میں واقعات پر تنقید و تبصرے نہیں ملتے۔مگر مسعودی ایک قدم بھی ذاتی فیصلے کے بغیر نہیں اٹھاتے۔مسعودی کے اندازِ بیان میں خود اعتمادی کی جھلک اور اپنی عظمت کا شعور نمایاں ہے۔واقعات پر جماعتی مسلک و اعتقاد سے بلند ہوکر تبصرہ کرتے ہیں۔مروج الذہب پہلی تاریخ ہے جس میں ادبی رعنائیاں،تمدنی خاکے،سماجی قدریں اور تاریخی حقائق ایک دوسرے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔یہ تاریخ اقوام بھی ہے، تاریخ ملل بھی، اس لیے کہ بعض اہم اسلامی معتقدات کے متعلق مسعودی نے بڑی اچھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

مروج الذہب زندگی کی خارجی سرگرمیوں کی تاریخ نہیں، بلکہ شعور کی داخلی کیفیات اور ذہنی ارتقاء کی تاریخ ہے۔مسعودی کا کینوس بہت وسیع ہے۔ وہ مذہب، تمدن، وقائع و حروب، معاشرت، نفسیات اور ادب و فلسفہ کو ایک

ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ عوامی زندگی کا بھرپور خاکہ پہلی بار مسعودی نے پیش کیا۔ خلفاء کے کردار کی بھرپور مصوری کی۔ مروج الذہب کا سب سے دلچسپ مبحث وہ ہے جس میں احمد بن طولون گورنر مصر اور ایک مسیحی عالم کے درمیان مناظرہ۔ اور پھر قبول اسلام کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

مسعودی کے بعد ابن القفطی، خطیب بغدادی اور ابن جوزی نے بھی تاریخیں لکھیں، لیکن وہ مروج الذہب کے معیار کو نہیں پہنچتیں۔

**ابن اثیر:**

مسعودی کے بعد اگر کسی کی تاریخ کو ہمہ گیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی تو وہ ابن اثیر کی الکامل فی التاریخ ہے جس کی جامعیت مروج الذہب سے ہمسری کا دم بھرتی ہے۔ علامہ شبلی کو عمر بھر افسوس رہا کہ انھیں الکامل نہ مل سکی، اس زمانہ میں اس کے نسخے کمیاب تھے۔ (سیرۃ النبی جلد اوّل)

مشہور ترین مؤرخ ابن خلکان ابن اثیر کے معاصر ہیں لیکن ان کے بڑے مداح اور ان کی مؤرخانہ صلاحیتوں کے زبردست معترف ہیں۔ اور انھیں مؤرخ کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا انسان بھی تصور کرتے ہیں۔ (ابن خلکان 289/2)

ابن اثیر بلاشبہ طبری سے بے نیاز نہیں ہوسکے اور الکامل کی ترتیب میں طبری ہی کو انھوں نے چراغ راہ بنایا۔ پھر بھی بعض اہم اور غیر معمولی مباحث کی بنا پر اسے ہم طبری پر بیش قیمت اضافہ کہہ سکتے ہیں۔ ابن اثیر نے تاریخ الکامل کی پہلی جلد ایام جاہلیت کی جنگوں کے لیے مخصوص کردی ہے اور ایام العرب کے عنوان سے ان جنگوں کا حال بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔

**ابن خلدون:**

اس سلسلہ میں اہم ترین شخصیت ابن خلدون کی ہے جس نے تاریخ عالم پر وسیع اور فلسفیانہ محاکمہ کرتے ہوئے اس فن کے باقاعدہ اصول وضوابط مقرر کیے اور مقدمہ کی پہلی جلد میں کتاب العبر کے عنوان سے ایک مؤرخ کے فرائض نیز قوموں کے عروج وزوال پر ایک پرمغز بحث کی۔ ابن خلدون نے ایک مؤرخ کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ کا سب سے بڑا مقصد ہمیں انسانی سماج اور تہذیب ومعاشرت کے متعلق معلومات بہم پہنچانا ہے۔ ابن خلدون نے تمام نوع انسانی کو صرف دو طبقے میں تقسیم کیا ہے۔ (1) شہری (2) بدوی۔ ریاستوں کی تشکیل اور سماج کی تنظیم پر ایک مفصل گفتگو کی ہے۔ تاریخ کی انقلاب آفریں کتاب مقدمہ ابن خلدون ہے۔ اس کی بدولت اس فن کو فروغ ہی نہیں حاصل ہوا بلکہ اس کو وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ بے پناہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

**وفیات ابن خلکان:**

ابنِ خلدون کے بعد سب سے اہم شخصیت قاضی شمس الدین ابن خلکان کی ہے، ابن خلکان کی 'وفیات' عوام کی نہیں بلکہ اشخاص کی تاریخ ہے، اس نادر علمی ذخیرہ میں کئی ہزار اشخاص کی سوانح عمریاں ابجدی ترتیب کے ساتھ پہلی بار مرتب کی گئی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اشخاص کسی خاص طبقہ یا جماعت سے متعلق نہیں، خود ابن خلکان نے لکھا ہے:

''میں نے ان اشخاص کی سوانح عمریاں مرتب کی ہیں جو علمی، ادبی، سیاسی ومذہبی کسی اعتبار سے عوام وخواص میں شہرت عظیم کے مالک ہیں۔''

وفیات میں خلفا اور صحابۂ کرام کو چھوڑ کر جن شخصیتوں کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد آٹھ سو پینسٹھ تک پہنچتی۔ تقریباً ایک ہزار اشخاص کی تاریخ پیدائش ودیگر مفصل حالات کی ترتیب وتدوین تاریخ نگاری کے اعلیٰ ترین مذاق کا بین ثبوت ہے۔

**وفیات العیون:**

یادش بخیر علامہ جلال الدین سیوطی کے ہمہ جہت قلم نے بھی اس طور کی ایک جامع کتاب ''تاریخ وفیات العین'' کے نام سے لکھی۔ یوں تو علم وفن کے ہر گوشہ میں ان کی کوئی نہ کوئی اہم تصنیف ضرور ہے۔ مگر بزم تاریخ میں ان کی شہرت تاریخ الخلفا کے مصنف کی حیثیت سے ہے، اگرچہ تاریخ الخلفاء اپنے پیش رووں پر کوئی اضافہ نہیں تاہم اس کی ایک مستقل حیثیت ہے۔

**مقریزی:**

سیوطی کے بعد قابل ذکر مورخ مقریزی ہیں جن کی کتاب ''السلوک لمعرفۃ الدول والملوک'' ایوبی حکمراں اور مملوک خاندان کی مفصل، مستند اور جامع تاریخ ہے، مقریزی کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے عہد سے لے کر قرون ماضیہ تک کے تاریخ نگاروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ چونکہ اس مضمون میں تمام کتابوں پر تبصرہ ممکن نہیں، اس لیے میں نے ان ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے عہد کی بہترین تاریخی تخلیقات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں تاریخ نہیں بلکہ سرچشمۂ تاریخ اور دوسری ہزاروں کتابوں کا مرجع وماخذ ہیں۔

تاریخ نگاری جو متمدن وتعلیم یافتہ اقوام کے علمی شعور اور فکری لطافتوں کا مظہر ہوا کرتی ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھی اور بلندیوں تک پہنچی۔ ریگستانوں کے تپتے ہوئے ذرات، کوہستانوں کی برفانی چوٹیاں، سمندروں کی خوفناک موجیں، صحراؤں کی ہولناک فضائیں، افیقہ وحبش کے غیر متمدن انسان اور مصر ویونان کی ثقافتوں کے علمبردار ہمارے احسان مند ہیں کہ ہم نے ان کو تاریخ کے صفحات میں جگہ دی اور ان کی روایات کو غیر فانی بنادیا۔ ❑❑

**تجزیہ**

نوشاد عالم چشتی (علیگ)

# مرزائی حقیقت کا اظہار

## (ایک تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ)

**قسط** -1

ہندوستان کے مشہور شہر میرٹھ کے معروف عالم دین اور عالمی شہرت یافتہ شیخ طریقت مبلغ اسلام حضرت علامہ شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی قادری میرٹھی علیہ الرحمہ کی ایام سفر میں تحریر کردہ کتاب 'مرزائی حقیقت کا اظہار' اہلِ علم کے نزدیک ردّ مرزائیت میں ایک شاہ کار تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔ حضرت علامہ صدیقی صاحب نے بغرضِ تبلیغ دینِ اسلام دنیا کے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا اور اپنے دلنشین وعظ و نصیحت اور تحریر خطابت سے بہت سارے بھٹکے اور گمراہ لوگوں کو حلقہ اسلام میں داخل فرما کر پرچم اسلام کو سر بلند کیا۔ مبلغ اسلام کی اکثریت و بیشتر زندگی ملک و بیرون ملک کے دورے میں گزری۔

1929ء کے اوائل فروری مبلغِ اسلام ہندوستان سے باہر ماریشس تشریف لے گئے اور پورٹ لوئس میں قیام فرما کر جامع مسجد پورٹ لوئس کو تبلیغِ دین کے لیے اپنا مرکز بنایا۔ ماریشس کے اسی سفر کے آخری ایام نیز واپسی کے دورانیہ میں آپ نے یہ معرکۃ الآرا تصنیف تحریر فرما کر فتنۂ مرزائیت کی سازش کو بے نقاب کر دیا۔ مبلغِ اسلام ماریشس کے اس دورے میں اپنی مصروفیات اور کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے ماریشس میں آتے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص جس دینی مسئلہ کو سمجھنا چاہے میرے پاس جامع مسجد پورٹ لوئس میں 10 بجے سے 4 بجے سہ پہر تک کسی وقت آئے اور سمجھ جائے۔ چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ اس عرصہ میں روزانہ آنے والوں اور مسائل سمجھنے والوں کا اس قدر ہجوم رہا کہ مجھ کو خواب و خور کی بھی فرصت بدقت ملتی تھی۔ اسی سلسلہ میں بہت سے مرزائی بھی آئے اور الحمدللہ کہ جو آئے میرے پاس سے نہ صرف لاجواب ہو کر بلکہ اطمینان پا کر ہی گئے۔ ان میں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی وہ الحمدللہ تائب ہو کر جماعت مسلمین میں شامل ہوئے۔ (مرزائی حقیقت کا اظہار، علامہ عبدالعلیم صدیقی، بار اوّل 1929ء مطبوعہ ینگ مسلم پریس، دہلی، ص2)

ماریشس میں جب مبلغِ اسلام سے مرزائیت کی اصلیت مسلمانوں کے سامنے واضح ہونے لگی تو وہ سادہ لوح مسلمان جو مرزائیت کے دامِ فریب میں کسی صورت سے آ گئے تھے ان میں سے کثیر تعداد میں لوگ دوبارہ سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت میں توبہ کر کے داخل ہونے لگے۔ اس فرقۂ باطلہ کو مبلغِ اسلام کے وعظ و نصیحت سے بڑا سخت دھچکا لگا، اس لیے اس گمراہ کن نظریے مرزائیت سے توبہ کر کے دائرۂ اسلام میں دوبارہ مراجعت کرنے والوں میں عام لوگوں کے علاوہ ماریشس کے بڑے بڑے رؤسا و مالدار حضرات بھی شامل تھے۔ انھیں بڑوں میں ایک شیخ عبدالرحیم صاحب بھی تھے جو اپنے بڑے قبیلے کے ساتھ مرزائیت سے تائب ہو کر پھر سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ حاملینِ مرزائیت کے مقامی قیادت کو مبلغِ اسلام کے دینی جدوجہد سے ماریشس میں اپنا پیرا اُکھڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ میدان ہاتھ سے نکلتا ہوا دیکھ کر مقامی مرزائی قیادت ذہنی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی اور مبلغِ اسلام کی تبلیغی کوششوں کو سبوتاژ کرنے اور اپنی ناک بچانے کے لیے عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیں۔ کبھی تو آپ کو مرزائیت کی طرف سے مناظرے کی دعوت دی گئی اور کبھی آپ کی محفلِ وعظ میں بدنظمی پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ اسی سلسلے میں روشن بھنو نامی ایک مرزائی نے تفہیم حق کے لیے آپ کے سامنے درخواست پیش کی اور کہا کہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ آپ سے یہ مسئلہ سمجھنا چاہتا ہوں اور اطمینانِ خاطر کے بعد مرزائیت سے تائب ہو جانا چاہتا ہوں، مگر میں کسی وجہ سے آپ جہاں قیام رکھتے ہیں وہاں نہیں آ سکتا۔ مبلغِ اسلام تقریباً 30 میل کا سفر کر کے فوری اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں روشن بھنو ملنا چاہتا تھا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ بجائے 6-7 آدمیوں کے وہاں پر تو 60 لوگوں کا مجمع ہے۔ آپ نے کہا کہ آپ ہمارے حافظ صاحب سے مناظرہ کریں۔ مبلغِ اسلام نے کہا کہ پہلے تمھارے حافظ صاحب شرائطِ مناظرہ، مقام اور وقت و دن کا تعین کر لیں، میں تیار ہوں۔ (ایضاً، ص2)

مگر جب مبلغِ اسلام نے مرزائیوں کے دعوت مناظرہ کو قبول کر لیا تاکہ ماریشس کے مسلمانوں کے سامنے بھی حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے تو مرزائی قیادت مناظرے سے فرار و گریز کا راستہ اختیار کرنے لگی۔ علاوہ ازیں جب مرزائیوں نے یہ جان لیا کہ اب ماریشس سے مبلغِ اسلام اپنے وطن تشریف لے جانے والے ہیں اور یہاں سے رخصت ہونے میں گنتی کے چند دن ہی باقی ہیں تو فوراً مرزائیوں نے سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کے عقیدے و نظریات اور مبلغِ اسلام کے خلاف ایک اشتہار شائع کر دیا۔ اسی اشتہار کے جواب میں مبلغِ اسلام نے اس کتاب کو تصنیف فرما کر قادیانیت و مرزائیت

☆موبائل: +919412562751، ای میل: naushadchishti@yahoo.com

کی مکروہ سازش کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا۔ مرزائیوں کی چھیڑ چھاڑ، خرافات اور ان کے وجوہات کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک اشتہار بعنوان 'حقیقت کا اظہار' نظر سے گزرا۔ اگرچہ ایسی بے سروپا عامیانہ تحریر کے جواب کی نہ مجھے فرصت، نہ حقیقتاً اس کی کوئی اشد ضرورت۔ مگر محض بدیں نیت کہ مبادا کوئی سادہ لوح اس تحریر کے سبب غلط فہمی کا شکار نہ ہوجائے، امر واقعہ کے اظہار کی ضرورت ہوئی۔ مشتہر صاحب وہی بزرگ ہیں جنھوں نے روز بل سینما کے مرزائی جلسہ میں یہ بیان فرمایا تھا کہ انھوں نے میرے نام کوئی خط لکھا ہے جس میں مجھ کو مناظرہ کا چیلنج دیا ہے۔'' (مرزائی حقیقت کا اظہار، ص1)

مزید لکھتے ہیں:

''بالآخر برادرِ دینی و یقینی عبدالرحیم صاحب کے مکان پر (جو اس سلسلہ میں مع اپنے بڑے قبیلہ کے مرزائیت سے تائب ہوئے ہیں) میں نے اپنے دورانِ وعظ میں اس کل مضمون ورقعہ کا اظہار کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اب میں عن قریب اس جزیرہ سے روانہ ہونے والا ہوں، مزید اتمامِ حجت کے لیے تمام مرزائیوں کو یہ سنا دینا چاہتا ہوں کہ اگر ان کے حافظ صاحب اپنے اعلان کے مطابق مجھ سے مناظرہ کرنا چاہتے ہیں تو 24 گھنٹے کے اندر اندر وہ موعودہ خط میرے پاس بھیجیں اور مناظرہ کرلیں۔ ورنہ ان کے اس جھوٹ کا سب پر اظہار اور ان کا مناظرہ سے فرار عالم آشکار ہوجائے گا۔ میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مرزائی احاطہ کی دیوار کے پیچھے سے کسی پردہ نشین نے یہ بانگ بے ہنگام بلند کی کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں لکھ کر ہمارے پاس بھیج دیجیے تب ہم شرائط مناظرہ وغیرہ سب لکھ بھیجیں گے۔ میں نے اس کے جواب میں فوراً للکار کر کہا کہ یہ پردہ کے پیچھے کون بولتا ہے؟ جس کو بولنا ہو سامنے آئے اور تمیز کے ساتھ جو بات کہنی ہو کہے۔ میری اس للکار کے بعد وہ آواز بند ہوگئی۔ بعض تجربہ کار احباب نے بعد جلسہ بتایا کہ وہ آواز حافظ صاحب موصوف ہی کی تھی۔'' (مرزائی حقیقت کا اظہار،3)

### مبلغ اسلام کا اصول تبلیغ:

مبلغِ اسلام کی مختلف تصانیف و تحریروں کے مطالعہ سے قاری کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ دینِ اسلام کی نشر و اشاعت اور احکام شرع کی تبلیغ میں حکمت و دانائی اور خوش اخلاقی و خوش اسلوبی کے قائل ہیں۔ فریق مخالف سے چھیڑ چھاڑ دل آزاری اور ان کے لیے پرتشدد الفاظ و جملوں کے استعمال کے آپ سخت مخالف ہیں۔ نہ تو آپ کسی کے ساتھ یہ قبیح طرزِ عمل کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ کرنا پسند فرماتے ہیں۔ آپ کی تبلیغ میں اخلاص و محبت کی جلوہ فرمائی پائی جاتی ہے۔ اسلوبِ خطابت اور مخاطبت میں دلکشی، شگفتگی اور سنجیدگی کا مظاہرہ عام ہے۔ آپ حمایتِ حق میں ردِّ باطل تو کرتے ہیں لیکن کسی کی دل آزاری کر کے اُسے دائرۂ حق میں شامل ہونے سے محروم نہیں کرتے۔ آپ اپنے تبلیغی اصول اور اندازِ تبلیغ کے متعلق مرزائی شر پسندی کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

''میں نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں محبت کے ساتھ دینِ حق کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ مجھے ضرورت نہیں کہ کسی کو مناظرے کا چیلنج دوں۔ ہاں! اگر کوئی مجھ سے مناظرہ کرنا چاہے تو میں بسر و چشم اس کے لیے تیار ہوں۔ اگر مرزائیوں کو تحریری چیلنج دوں تو مجھے چاہیے کہ عیسائی، بدہشٹ، سناتنی، آریہ سب کو ایسی ہی تحریر بھیجوں ورنہ اس کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔'' (نفس مصدر، ص4)

اپنے طرزِ تقریر کی عوامی مقبولیت کا ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میں یقیناً اسی اصولِ حکمت سے کام لے کر جس کی ہدایت قرآن حکیم نے فرمائی بہت محبت کے ساتھ بے دینوں کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں اور بمنہ تعالیٰ کامیاب ہوتا ہوں، نہ کسی پر حملہ کرتا ہوں نہ کسی کا دل دُکھاتا ہوں جس کا عملی ثبوت اسی سے مل سکتا ہے کہ جزیرہ بھر کے ہر اُس پبلک جلسہ میں جہاں میں نے تقریر کی ہمیشہ کثرت کے ساتھ غیر مسلم حضرات شرکت فرماتے رہے اور ہر فرقہ کے افراد میرے طرزِ کلام کی داد دیتے ہوئے ہی رخصت ہوئے حتیٰ (کہ) 'واکوئے' کے ایک جلسہ میں تو ایک پادری صاحب نے بے ساختہ ایسی بے نظیر مختصر تقریر فرمائی جو ان کے اسلام سے قریب تر ہونے پر دلالت کر رہی تھی۔ دوسرے ایک انگریز رئیس نے بہت مناسب الفاظ میں طرزِ تقریر کی داد دیتے ہوئے اس کی تائید کی نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ انھی تقریروں سے متاثر ہوکر اس وقت تک تقریباً 50 آدمی مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں۔ (نفس مصدر، ص5)

مبلغِ اسلام شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی کی مختلف تصنیفات و تحریرات اور وعظ و نصیحت کی روشنی میں ان کی شخصیت کا تجزیہ کرنے پر جو روپ ان کا اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ بڑا پرکشش اور دل نشیں ہے۔ وہ فطرتِ سلیم کے مظہر اور حلیم طبع نظر آتے ہیں۔ مبلغِ اسلام نے اپنے جس اندازِ تبلیغ کا اظہار اپنی مذکورہ بالا تحریر میں کیا ہے اس معیار کو اپنی تمام تصانیف میں برقرار رکھا ہے۔ بطور مثال اپنے دعوے کی حمایت میں ایک اور حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ میلاد شریف کے موضوع پر ایک بہترین تصنیف بنام 'ذکرِ حبیب' مبلغِ اسلام نے تحریر فرمائی۔ اس موضوع پر یہ ایک نہایت مستند کتاب ہے جو آپ

نے اپنی ایک صاحبزادی کی فرمائش اوراپنے ایک کرم فرما صوفی سید بشارت علی قادری نقشبندی، مجددی، توکلی محبوبی کی خواہش پر لکھی ہے۔ (ذکر حبیب، علامہ عبدالعلیم صدیقی، باراوّل 1987ء ناشر سنی تبلیغی جماعت، بھیونڈی، ص8) آپ نے اس میں جابجا مختلف شعرا کے کلام کو بھی موقع ومحل کے اعتبار سے نقل فرمایا ہے۔ نمازِ عصر اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے واقعہ کو بیان فرماتے ہوئے فاضل بریلوی کی ایک نعت کے دوشعر آپ نے یوں لکھے ہیں:

عرشِ حق ہے مسند رفعت رسول اللہ کی
دیکھنی ہے حشر میں عزت رسول اللہ کی
سورج اُلٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہوشق*
منکر و دیکھو یہ ہے قدرت رسول اللہ کی

(ذکر حبیب، علامہ عبدالعلیم صدیقی، ص21)

اہلِ علم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ فاضل بریلوی کی مذکورہ نعت کے دوسرے شعر کا آخری مصرع مبلغِ اسلام کے نقل فرمودہ مصرع کے مطابق نہیں ہے جسے آج بھی مختلف مطابع سے شائع شدہ حدائق بخشش میں دیکھا جاسکتا ہے، بلکہ فاضل بریلوی کا اصل مصرع مندرجہ ذیل ہے:

اندھے نجدی دیکھ لے قدرت رسول اللہ کی

مگر مبلغِ اسلام نے اپنی کتاب میں تبلیغی حکمت کے پیشِ نظر فاضل بریلوی کے خلیفہ ہونے کے باوجود بھی ''اندھے نجدی دیکھ لے'' جیسے پرتشدد جملے کی جگہ پر ''منکرو دیکھو یہ ہے'' الفاظ استعمال کر کے مکمل طور پر مصرع کا مزاج ہی بدل دیا ہے اور ''اندھے نجدی دیکھ لے'' میں شدت کی جوزیادتی پائی جاتی ہے اس کا احساس مبلغِ اسلام کے تصرف کردہ مصرع ''منکرو دیکھو یہ ہے'' میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ قارئین خود مذکورہ دونوں مصرعوں کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ چونکہ محفلِ میلاد میں خوش عقیدہ افراد کے علاوہ کبھی کبھی بے گانوں کے شامل ہونے کا بھی امکان رہتا ہے، اس لیے مبلغ اسلام نے انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے شیخ اجازت فاضل بریلوی کے کلام کے اس مصرعے میں ترمیم وتصرف کر کے اپنی کتاب میں لکھا۔ اس لیے آپ کا مرزائیوں سے یہ کہنا کہ ''نہ کسی پر حملہ کرتا ہوں نہ کسی کا دل دُکھاتا ہوں'' بالکل صد فیصد اس حوالے کی روشنی میں درست ہے۔ مبلغِ اسلام کی شخصیت کا یہ پہلو موقع کی نزاکت کے اعتبار سے وقتی نہیں بلکہ آپ کے سلیم الطبع فطرت کا دائمی خاصہ ہے جو تاحیات قائم رہا۔ مرزائی ہرزہ سرائی کا جواب دیتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''ہاں چوں کہ کفر مرزائیت سے تائب ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے یہی حافظ صاحب پر شاق، تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ میں نے ہرگز ہرگز کبھی کسی پر حملہ نہیں کیا۔ ہاں! جب مرزائیوں کی طرف سے مناظرہ کی چھٹی کی جھوٹی خبر گرما گرمی کے ساتھ مشہور کی گئی تو مجبور ہوا کہ کھلے طور پر لوگوں کو مرزائیت کی حقیقت سے آگاہ کردوں۔ اس سلسلے میں جو الفاظ حافظ صاحب کو گراں گزر سکتے ہیں وہ میرے نہیں بلکہ خود مرزا صاحب ہی کے کلمات ہیں۔ میں صرف ان کا دہرانے والا ہوں۔''

(ذکر حبیب، علامہ عبدالعلیم صدیقی، ص21)

مبلغ اسلام کے مذکورہ اقتباس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تبلیغ میں انتہائی سنجیدگی کے قائل ہیں۔ مدمقابل کی تذلیل وتضحیک اور تنقیص وتخریب کاری آپ کا مقصود نہیں۔ آپ کی تحریر میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے سلسلے میں مدمقابل کے نقد وتعاقب میں جرأتِ اظہار، مومنانہ شان وفراست، برجستگی، قوتِ استدلال اور لطیف طنز ومزاح کا عنصر بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے مگر تعلّی وتفاخر کا دُور دُور تک نام ونشان نہیں ملتا ہے۔ طنز ومزاح اور تنقیص وتضحیک میں جو بنیادی فرق ہے مبلغِ اسلام اسے اپنی تحریر وتقریر میں ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔

### مناظرہ کے متعلق مبلغِ اسلام کا نقطۂ نظر:

ماریشس میں جب روشن بھنو نامی مرزائی شخص نے مبلغِ اسلام سے کہا کہ آپ ہمارے حافظ صاحب سے مناظرہ کریں اور ہم سنیں اور فیصلہ کریں۔ (مرزائی حقیقت کا اظہار، ص2) تو اس کے جواب میں مبلغِ اسلام نے ارشاد فرمایا کہ:

''یہ آپ کی خواہش ہے مگر وہ آپ کے حافظ صاحب بھی مناظرہ کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ میں تو عرصہ سے ان کے خط کے انتظار میں ہوں جس کا انھوں نے جلسہ روز بل سینما میں اعلان فرمایا تھا۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق ان سے مناظرے کے لیے بھی تیار ہوں بشرطیکہ وہ اپنا دستخطی اقراری خط میرے پاس بھیجیں جس میں یہ لکھی ہے کہ کن مسائل پر، کن شرائط کے ساتھ، کس وقت اور کہاں مناظرہ فرمانا چاہتے ہیں۔ ان کا خط آنے کے بعد میں ان شرائط پر غور کروں گا۔ اور جب میری اوران کی باہمی رضامندی سے شرائط مناظرہ تحریری طور سے طے ہوجائیں گے تو ان شرطوں کے مطابق مناظرہ کرلوں گا تاکہ ایک فیصلہ کن صورت آپ کے سامنے

* 'حدائق بخشش' از فاضل بریلوی کے کئی پرانے نسخوں میں یہ مصرع یوں ہی پایا جاتا ہے مگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی صاحب کا تصحیح کردہ نسخہ جسے رضا اکیڈمی ممبئی نے پہلی بار جولائی 1997ء میں شائع کیا اس میں یہ مصرع ''سورج اُلٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہوشق'' کے بجائے ''چاند اشارے سے ہوچاک'' ہے۔

آ جائے۔'' (مرزائی حقیقت کا اظہار، ص2)

مذکورہ بالا اقتباس کا ایک ایک جملہ بار بار غور سے پڑھیے اور مبلغِ اسلام کی مناظرانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایئے۔ ان چند جملوں میں آپ نے اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ بغیر طے شدہ تحریری شرائط کے مناظرہ، مناظرہ نہیں بلکہ فریقین کے درمیان زبان درازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس سے کوئی نتیجہ خیز صورت سامنے نہیں آتی بلکہ ہر فرد چرب زبانی سے اپنے آپ کو فاتح اور اپنے عقیدے و نظریات کو برحق گردانتا ہے، مگر قانون وضابطہ اور شرائط نیز حَکم کے ماتحت جب مناظرے کی مکمل کارروائی ہوتی ہے تو پبلک کے سامنے ایک فیصلہ کن نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے مبلغِ اسلام نے درست نتائج کو منظرِ عام پر لانے کے لیے اصول وضوابط کے تحت مناظرہ کرنے کے لیے کہا۔ مبلغِ اسلام کے اس مطالبے کے تحت مرزائی حافظ مناظرے کے لیے آخری دم تک تیار نہیں ہوسکا اور آپ کی موجودگی کی آخری گھڑی تک ان شرائط کے ساتھ وہ آپ کے سامنے آنے سے گریز کرتا رہا اور جب آپ جزیرہ ماریشس سے واپس ہونے لگے تو بالکل آخری ایام میں مرزائی قیادت کی طرف سے پوسٹر بازی کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔

### مبلغِ اسلام اور جذبہ خدمت دین:

مبلغِ اسلام جزیرۂ ماریشس میں بے شک مبلغِ اسلام کے لیے گئے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قادیانیوں سے معرکہ آرائی کے لیے تیار ہوکر ان کی تمام کتب ورسائل بھی ساتھ لے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہ صرف آپ نے مناظرہ کے لیے مرزائیوں کا چیلنج قبول کیا بلکہ ان کے اشتہارات کا جواب بھی تحریری شکل میں نہایت حکیمانہ و مدلل معرکۃ الآرا انداز میں دیا۔ مبلغِ اسلام، مرزائی اشتہار بازی کے متعلق لکھتے ہیں:

''مناظرہ سے مرزائی حافظ صاحب کا فرار اظہر من الشمس ہوگیا اور شاید خود ان کے فرقہ کے لوگوں نے ان کو ان کے جھوٹے وعدے اور جھوٹے اعلان پر، پھر میری تقریر کے دوران میں بولنے اور میرے بلانے کے باوجود سامنے نہ آنے پر شرمندہ ہوا ہوگا اور ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی ہوگی کہ کہیں لگی لگائی روزی ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔ اس لیے کہ اب قادیانی فنڈ کی آمدنی بھی برادرم شیخ عبدالرحیم کے تائب ہونے کے بعد کم ہوگئی تو مجبور ہوکر جناب حافظ صاحب نے اشک شوئی کے لیے وہی اشتہار بازی کا طریقہ اختیار کیا جو ہمیشہ مرزائی صاحب اور ان کے پیرووں کا شعار رہا ہے تاکہ ادھر اشتہار کی سرخی میں میرا نام ہونے کے سبب ان کا اشتہار فروخت ہو، آمدنی کی صورت نکلے، اُدھر مرزائیوں کو تسلیم دینے کا بھی موقع ملے کہ ہم نے اور کچھ نہیں تو بے سر وپا اشتہار ہی دے دیا۔ ان کو یہ تو یقین ہے کہ مسلمانانِ ماریشس کے پاس کوئی اُردو کا پریس نہیں، کاتب نہیں، پتھر نہیں پھر جواب چھاپیں گے تو کیوں کر۔ پھر میرے متعلق بھی یہ یقین ہوگیا کہ پابہ رکاب ہوں اور عدیم الفرصت۔ لہٰذا اس موقع کو غنیمت جان کو اشتہار چھاپا کہ اسی بہانے سے مرزائیوں پر رعب جم جائے اور یہ کہنے کا موقع ملے کہ دیکھو ہمارے اشتہار کا کسی نے جواب نہ دیا۔ مگر انھیں معلوم ہوجانا چاہیے کہ الحمدللہ خدامِ دینِ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہٖ اجمعین وسلم ہر خدمتِ دین کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریر کا جواب بھی حاضر ہے۔'' (نفس مصدر، ص5)

بحالت سفر وطن اور اپنی قیام گاہ سے دُور ہونے کے باوجود مبلغِ اسلام کا مرزائیت کے چیلنج مناظرہ کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے قبول کرنا ان کی اشتہار بازی کے جواب میں معقول علمی انداز میں تحریری جواب دے دینا یقیناً مبلغِ اسلام کا وہ قابلِ فخر کارنامہ ہے جس پر ہم جتنا بھی ناز کریں وہ کم ہے۔ قادیانیوں کی طرف سے اسلامی عقیدے کے خلاف دو اشتہار شائع ہوئے اور آپ نے سب کا جواب دیا۔ تقریری اور تحریری دونوں اعتبار سے آپ نے جواب دے کر اعلائے کلمۃ الحق کا پرچم سربلند رکھا۔

### مبلغ اسلام کا تبحر علمی:

مرزائی حافظ نے اپنے عقیدے کی حمایت اور مسلک اہل سنت کے خلاف دو اشتہار نمبر اوّل یک رُخی دو ورقی اور نمبر دو دو رُخی دو ورقی بنا 'حقیقت کا اظہار' شائع کیا۔ (نفس مصدر، ص1، 7) مبلغ اسلام نے مرزائی اشتہار کا عنوان 'حقیقت کا اظہار' سے قبل لفظ 'مرزائی' کا اضافہ کرکے 'مرزائی حقیقت کا اظہار' عنوان منتخب کرکے مرزائی اشتہار بازی کا تحریری طور پر بھی منہ توڑ جواب دیا، جسے محاورے کی زبان میں 'پانسہ پلٹ دیا' کہا جائے گا۔ اس سے مبلغِ اسلام کی برجستگی اور تبحرِ علمی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ مبلغِ اسلام نے بھی مرزائی اشتہار کا جواب تین جز میں دیا۔ پہلے دو جز کو تو آپ نے ماریشس میں قیام کے آخری ایام میں ہی لکھا مگر تیسرا جز سفر کے دوران پانی کے جہاز کے کیبن میں لکھا، مگر کتابی صورت میں تینوں جز بنام 'مرزائی حقیقت کا اظہار' ایک ساتھ ناشر کی ضروری گزارش اور صدر الافاضل علامہ نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ کی تقریظ سے مزین کرکے مئی 1929ء میں شائع کی گئی۔ 'مرزائی حقیقت کا اظہار' کی تصنیفی سرگزشت کا ذکر کرتے ہوئے مبلغِ اسلام رقم طراز ہیں:

''باوصف مشاغلِ کثیرہ چلتے چلتے قلم برداشتہ دو نمبروں کے جواب دے ہی چکا تھا، اب کہ جہاز میں سفر کررہا ہوں۔ چاروں طرف نصاریٰ کا

ہجوم ہے، خود میری کیبن میں چار کیتھولک پادری میرے قریب کے کیبن میں پادریوں کا انسپکٹر پروٹسٹنٹ پادری وغیرہ بھی۔ بہت سے آزاد خیال افراد میں بھی بہت سے منچلے...... میرا وہی حال ہے جو ماریشس میں تھا۔ چاروں طرف مختلف قسم کے مسائل پوچھنے والے ہجوم کیے ہوئے، اور میں تن تنہا جواب دینے کے لیے، یکسوئی کے ساتھ تحریر کی مہلت عنقا۔ پھر اس پر یہ عجیب ماجرا کہ ایک طرف دائیں آنکھ میں سخت درد، دوسری طرف تکلیف دردتھا۔ بمنہ اللہ اس حالت میں جو کچھ لکھا گیا وہ حاضر۔ مالک عالم کلام میں اثر دے جو ناظرین کے قلوب کو انوارِ ہدایت سے بھر دے۔ اگر اسے دیکھ کر ایک مرزائی بھی راہِ راست پر آ گیا تو یہ بہترین ثمرہ ہوگا۔'' (مرزائی حقیقت کا اظہار، ص 86)

بھول چوک، سہو یا نسیان سے علاوہ انبیا کے کوئی فرد بشر مبرا نہیں۔ مبلغِ اسلام بشریت کے اس فطری تقاضے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور اپنی گوناگوں مصروفیت کے باعث بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں:

''مجھے مسودہ کو صاف کرنا تو کجا بغور نظر ثانی کی بھی فرصت نہیں۔ اس لیے ناظرین سے التجا کہ اگر کہیں سہو وسستی پائیں تو معاف فرمائیں، بلکہ خود اصلاح فرمالیں۔ دعائے خیر میں ہمیشہ یاد کرتے رہیں کہ مالک عالم اعدائے دین کی سرکوبی اور دینِ متین کی صحیح خدمت کے لیے مزید وقت وہمّت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین بجاہ طٰہٰ ویٰسٓ صلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین و آخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

محمد عبدالعلیم الصدیقی القادری
کیبن نمبر 219، ایس ایس وارڈ
یکم مئی 1929ء (نفس مصدر، ص 86)

مگر سامعین وقارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ قیامِ سفر کے آخری ایام اور دورانِ سفر میں لکھی ہوئی کتاب 'مرزائی حقیقت کا اظہار' زبان و اسلوب اور نقد وتحقیق کے اعتبار سے بہت بلند ومعیاری کتاب ہے۔ مبلغِ اسلام نے قرآن، تفسیر وحدیث اور کتبِ تاریخ وسیر کی جن کتابوں کے حوالے سے اپنی تصنیف کو مزین کیا ہے ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

(1) قرآن کریم (2) بخاری (3) مسلم (4) ترمذی (5) ابوداؤد (6) فتح الباری (7) مشکوٰۃ (8) سیر الاقطاب (9) فتح المغیث (10) دُرِّ منثور (11) طبقاتِ کبریٰ (12) بیہقی (13) تفسیر ابن کثیر (14) تفسیر ابن جریر (15) ابن ہشام (16) کتاب الوفا (17) کنز العمال (18) الشرح السنہ۔

خاص مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے حواریوں کی جن کتب کو بطور حوالہ استعمال کیا ہے ان کی تعداد 30 سے زائد ہیں۔ ذیل میں ان کی فہرست بھی ملاحظہ کریں:

(1) انجام آتھم (2) ضمیمہ انجام آتھم (3) شہادۃ القران (4) اربعین (5) نزول المسیح (6) دافع البلا (7) حقیقۃ الوحی (8) البشریٰ (9) براہینِ احمدیہ (10) ازالۂ اوہام (11) تحفۂ گولڑویہ (12) آسمانی فیصلہ (13) توضیح المرام (14) کتاب البریہ (15) لکچر مرزا صاحب (16) آئینہ کمالات (17) حقیقۃ النبوۃ (18) کشتی نوح (19) ٹریکٹ اسلامی قربانی (20) جنگ مقدس (21) اخبار بدر (22) اشتہار نصرتِ دین (23) مواہب الرحمٰن (24) الحکم قادیان (25) الحکیم (26) تریاق القلوب (27) اشتہار تبصرہ (28) اعجازِ احمدی (29) فضل الخطاب (30) جنگ مقدس۔

علاوہ ازیں اور دیگر کتابوں کو بھی بطور حوالے کے آپ نے استعمال و پیش کیا ہے جن میں بطورِ خاص 'اعلان الحق'، 'گیتا اور بھاگوت پران'، 'یوز آصف اور بلوہر' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا کتب ورسائل اور اشتہارات وتصنیفاتِ مرزا کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مبلغِ اسلام کو حقیقتاً ردِّ مرزائیت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ 'مرزائی حقیقت کا اظہار' نامی کتاب دراصل آپ کی ردِّ مرزائیت پر کامل دسترس ومہارت رکھنے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں اپنے اس دعوے کی دلیل میں تمام اُردو داں اہلِ علم صاحبان کو اس مذکورہ کتاب کے مطالعے کی دعوت یہ کہتے ہوئے دیتا ہوں کہ 'ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، پڑھے لکھے کو فارسی کیا؟ اہلِ علم خود اس کا مطالعہ کریں اور پھر اس کی قدر و قیمت کا تعین کریں۔ صدر الافاضل حضرت علامہ نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ مبلغِ اسلام شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ کے تبحرِ علمی اور مہارتِ تامہ تامہ کی طرف قارئین کتاب کو متوجہ کرتے ہوئے اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''عزیزی ومحبی حامیِ دین، ناصرِ شرحِ متین مولانا الحاج شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی نے مرزائی کا قلم برداشتہ جواب سفر کی رواروی اور جہاز پر ملاقاتوں کے ہجوم میں ایسا لکھا کہ باید وشاید۔ حقیقت واضح ہوگئی اور مرزائیت کے بطلان کا پردہ فاش ہوگیا۔

مرزائی مبلغ کا ردّ بحمداللہ ابلغ وجہ پر ہوا اور مرزائی دین کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ سلاست بیان، روانیِ مضمون، قوتِ دلیل، حسنِ ادا ایک ایک بات قابلِ تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ جناب مولانا کی اس تحریر کو گم گشتگان راہ کے لیے ذریعہ بنائے۔'' (مرزائی حقیقت کا اظہار، ص 88)

مبلغِ اسلام کی شان میں تحریر شدہ صدر الافاضل کے مذکورہ بالا جملے میری موقف کی حمایت میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

(جاری)

محمد عمران رضا سنبھلی ☆

# ایران کے خلاف اسرائیل کے ناپاک عزائم

ضلع، بستی، قریہ، شہر، صوبہ، ملک، بیرونِ ملک، جہاں دیکھو مسلمان بحیثیت مسلمان تشدد کی سلگتی ہوئی آگ کے انگاروں میں جھلس رہا ہے۔ کہیں سیاست، مذہب اور نسل تو کہیں ملکی اور ذات برادری کی تفریق سے دوچار ہے۔ کسی غیر اہم بات پر نفرت کے آتش فشاں پھوٹنے میں کسی طرح کی تاخیر نہیں بلکہ چند لمحات میں ایک ماں باپ سے تولد شدہ انسان ہمہ وقت انتقام کے واسطہ اپنے بھائی کے روبرو سینہ سپر ہوکر تباہی کے صحرا میں موجود نظر آرہا ہے۔ اس آپسی انتشار میں اخلاقی اقدار تو درکنار مذہبی دینی قدروں کو بھی پامال کیا جارہا ہے، جن کے غلط اثرات سے انسانی حقوق کے صالح اور صحیح تصورات بھی معدوم ہوتے جارہے ہیں کہ جن تصوراتِ اسلامی اور نظریاتِ صحیحہ کے دعوتی، عملی اثرات و واقعات موجودہ نسل پر اثر انگیز ثابت نہیں ہو پارہے ہیں۔ جن کے تناظر میں مستقبل قریب کے تعلق سے بھی یہ بات نہیں سوچی یا کہی جاسکتی کہ مسلمان آئندہ بھی اپنی ملتِ نو کے لیے کوئی متحدہ محاذ تشکیل کرپائیں گے یا نہیں۔ فی الحال ان کے مابین ذاتی اختلافات و انتشار کی راہیں اتنی ہموار ہوچکی ہیں اور مزید ہوتی جارہی ہیں کہ جتنی ان کے مابین شرعی حدود بھی مختلف نہیں، جس کا سبب خود مختاری اور اقتدار پسندی کے حصول کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ جس کو پروان چڑھانے کے لیے مذہبی جبہ و دستار اور مختلف فیہ مسائل شرعیہ کا سہارا لیتے ہوئے ذاتی اختلاف کو تقویت دی جارہی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کو تحقیر و تذلیل کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ آج جو عوام الناس کے درمیان اتحاد پارہ پارہ ہے وہ صرف خواص کے عناد اور ذاتی انتشار کی بنیاد پر ہی ہے، ورنہ اتحادِ عوام کوئی دشوار کن مسئلہ نہیں۔ اتحادِ امت کے لیے تصورات اسلام ہی فقط ایسا نسخۂ کیمیا ہے، جس کو اپنا کر ہی صرف امت اتحاد کے مکمل پیرائے سے آراستہ ہوسکتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر اتحاد و یکتا کے اعتبار سے بہت ہی منفرد المثال کی حیثیت رکھتا ہے، جو بارہا لائقِ تعریف ہے۔ چونکہ پندرہ سو سال پہلے انسان کو خانہ جنگی، قوم پرستی، اونچ نیچ اور خون خرابہ کے جن نازک اور کمزور حالات سے اسلامی فکر نے جس طرح سے نکال کر پُرامن اور اتحادِ باہمی کے ماحول میں لاکر کھڑا کیا تھا واقعی وہ تصوراتِ اسلامی کو ہمہ وقت اور خصوصاً آج فالو (Follow) کرنے کی دعوت دیتی ہے، جس کے مقابلہ میں ہونے والی آج کی متعدد و بے شمار کانفرنسیں اور حقیقی قیامِ امن کے لیے امنِ عالم کونسلیں بھی مکمل طور پر نتیجہ ندارد کے مثل ہیں۔ چونکہ امنِ عالم کے نام سے ان منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور جماعتوں کی بنیادیں ہی اختلافی زمین پر ہیں تو پھر ان سے اتحاد کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ آج عالم اسلام کے طول وعرض میں ملت کی شیرازہ بندی کی خاطر بڑے پیمانے پر حامیانِ ملتِ ملک کی کثیر آبادی اپنی جانب مائل کرنے کے لیے ہر اس نت نئی کوشش اپنانے میں مصروفِ عمل ہیں جس سے ملک و بیرونِ ملک کی اکثریت ان کے کھاتے کا حصہ بن سکے۔

ایسی سوچ کو قوم وملّت کے اتحاد سے کبھی کسی بھی صورت تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مذہبی نظریۂ اتحاد کے علاوہ کوئی ایسا نظریہ نہیں جو آج کی شیرازہ بندی کا ضامن و وکیل بن سکے۔ اسلامی تفکرات و خیالات کلی طور پر وحدتِ انسانی کے ضامن و امین ہیں، لیکن اس کے برخلاف افکار جب قوم کے سامنے پیش کیے جائیں تو ان سے کسی حد تک اتحاد ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ افکار فقط ذاتی اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن ان کے اسلامی تفکرات محض دینی استحکام و مذہبی بھائی چارگی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تخیلاتِ اسلامی سے ہی اسلام پسندوں کے اتحاد و اتفاق کی اُمید کی جاسکتی ہے اور آج وقت پھر اسی بات کا متقاضی ہے کہ عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر ہونا چاہیے۔ کیونکہ ماضی قریب میں مسلم ممالک کے یہودی و نصرانی حکومت کے آگے پسپائی کے اسباب وعلل جہاں اور ہیں وہیں ایک اہم سبب مسلم حکومتوں کا عدم اتحاد بھی ہے جسے بھانپنے کے بعد سامراجی اور استعماری حکومتوں نے اپنے تکنیکی ذرائع وابلاغ کے ساتھ کچھ مسلم حکومتوں کا وقتی طور سے ارضی، مالی، بحری جہازوں اور فوجی تعاون کا سہارا لیتے ہوئے مسلم ممالک کو ناگفتہ بہ حالات سے دوچار کرڈالا جس کی مثال عراق اور افغانستان ہیں۔ عراق کی تباہی و بربادی کا سہرا کسی نہ کسی طور سے سعودیہ و کویت کے سر بندھتا ہے اس کے ساتھ ترکی بھی جرم میں ان سے کم نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ، اسرائیل اور یورپین حکومتیں تمام عالم اسلام میں سامراجی نظام کی توسیع کے لیے بہت کوشاں ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی مسلم ملک سائنسی، نیوکلیائی ٹیکنالوجی اور تکنیکی شعبہ جات

☆ محلہ نخاسہ، ضلع بھیم نگر (سنبھل)، یوپی، موبائل: 09837123277

میں ترقی کر سکے، جس کے بعد تکنیکی میدان میں ہم سے فوقیت حاصل کرنے کے بعد ہمارے وجود کو ہی نیست و نابود کر دے۔

اس لیے امریکہ واسرائیل نے شروع ہی سے تکنیکی شعبہ میں ایران کی دن بدن ترقی کو عالمی پیمانہ پر امن عالم کے لیے خطرہ بتا کر اس ترقی کو روکنے کی سازشیں کیں اور آج بھی ایران کے نیوکلیائی پروگرام کو روکنے کے درپے ہے۔ پچھلے دو برسوں میں امریکہ و اسرائیل کی ریشہ دوانیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ایرانی معیشت اور ایران کی صنعتی ترقی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے ایران کے کئی نیوکلیائی سائنس داں مارے جا چکے ہیں۔ مغربی حکومتوں کا یہ پرانا ڈھرّا رہا ہے کہ جب انھوں نے کس کو ترقی کی شاہ راہ پر دیکھا تو اس کو عالمی دہشت گردی کے نام سے جوڑ کر اس کی شبیہ مسخ کر کے اسے لاچار کر ڈالا۔ آج بھی اسرائیل اور امریکہ کو ایران سے یہی خوف ہے اور اسی کی بنیاد پر اسرائیل ایران کو اس کے نیوکلیائی پروگرام روکنے کے لیے دیگر ممالک سے بھی ایران سے تعلقات منقطع کرانے پر دباؤ اور زور آزمائی کی جارہی ہے۔ طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ جبکہ ان پابندیوں کے لیے خود امریکہ اور اسرائیل زیادہ حقدار ہیں کیونکہ خود اسی نے ان صنعتی آلات کے ذریعہ دنیا کے اکثر خطوں میں کافی کہرام مچا رکھا ہے۔ لیکن جو بات آج ہم جیسے معمولی انسان بے باکی سے کہہ رہے ہیں ان کو مسلم حکمراں کیوں کہنے کے لیے تیار نہیں۔ آخر ان کی یہ مجبوری کب تک تماشائی بنے بیٹھے مسلم ممالک کے ہلاکت خیز مناظر دکھاتی رہے گی؟ کب تک فرداً فرداً مسلم حکمراں ایک دوسرے کے ساتھ ہونے والے ظلم و استیصال کو دیکھ کر ہنستے رہیں گے؟ کیا یہ بات ان کے ذہن میں کبھی نہیں آئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن ہم بھی مغربی تشدد کا نشانہ بن جائیں؟ یا پھر فلسطین، عراق، بغداد میں رہنے والے مسلم باشندوں کے لیے تھوڑا بھی درد ان کے سینوں میں نہیں جن کے ساتھ صبح وشام خونی کھیل کھیلا جاتا ہے؟ کیا سعودیہ کی نظر میں اسرائیل وامریکہ کا تکنیکی جنگی اسلحہ فلسطین میں استعمال کرنا ملک کی امن پسندی کا خاتمہ اور انسانیت کے ساتھ ظلم نہیں؟ کیا اسرائیل کے لیے بم دھماکوں سے مسلم جانوں کا تلف کر دینا روا ہے؟ یہ مسلم حکمرانوں سے کیے ہوئے وہ سوالات ہیں جن کے بعد مظلوم فلسطین، ایران نیوکلیائی پروگرام کی حمایت اور امریکہ و اسرائیل کی استعماریت و سامراجی عزائم رکھنے والی قاتلانہ نگاہوں کی مخالفت کرنا اور منہ توڑ جواب دینا انسانیت دوستی کا ثبوت ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایران کے علاوہ دوسرے ممالک کو بھی تکنیکی صنعتی راہ میں پیش رفت کرنی چاہیے تا کہ سبھی وسائلِ زمانہ سے لیس ہو کر مغربی طاقت کو کمزور ثابت کر سکیں۔ آج وقت آپسی اختلافات کی یاد دہانی کا نہیں بلکہ معاندین کی عزائم شکنی کا ہے۔ تمام ہی عالم اسلام کے حکمراں نیز باشندوں کو چاہیے کہ اصلاحی اعلیٰ اصول وضوابط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دوسرے کے مقابل اپنی سب سے بڑی طاقت اخوت واتحاد بین المسلمین کو مستحکم کریں۔ کیونکہ ماضی کی طرح امریکہ واسرائیل اس بار پھر کسی مسلم ملک کے دوستانہ ہاتھ بڑھنے کے منتظر اور خواہشمند ہیں۔ جن کے قدم سے قدم ملا کر ایران کو بھی پہلوں کی طرح ویران کر دیا جائے۔ اپنے سپر پاور خوف سے دوسرے ملکوں کو بھی خوف زدہ کر دیا جائے تا کہ کل کوئی ہمارے سامنے دنیا کی بڑی طاقت بن کر نہ اُبھر سکے۔ باطل طاقت کے اس نظریہ کو اتحاد باہمی سے ہی چکنا چور کیا جا سکتا ہے:

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشیدِ مبین
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

منظر محسن نعیمی ☆

# دھلی مدرسہ بورڈ
# کیا خدشات حقیقت پر مبنی ہیں؟

ملت کے قائدین اور سربراہوں کی دورنگی میری سمجھ سے باہر ہے۔ حکومت جب مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کرتی تو ان کے زبان وقلم حکومت کی بے حسی پر شعلے اگلتے ہیں اور جب وہ کچھ کرنا چاہتی ہے تو اسے اسلامی تشخص کے خلاف سازش قرار دیا جاتا ہے ماضی قریب میں مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کی جس قسم کی مخالفت بعض حلقوں کی جانب سے کی گئی پہلے کبھی نہیں کی گئی حتی کہ انگریزی دور حکومت میں بھی کچھ اسی طرح کی صورت حال اس وقت ہمارے سامنے ہے جب کہ دہلی مدرسہ بورڈ کے حوالے سے گفتگو ہورہی ہے۔ دراصل مدرسہ بورڈ کی مخالفت ذاتی مفادات کی بنا پر ہے اس وقت مدرسے خصوصاً چند بڑے مدرسے چند سفید پوش افراد کے لئے منفعت بخش کاروبار بنے ہوئے ہیں اور اب جب کہ مدرسہ بورڈ کی تجویز آئی تو انہیں لگ رہا ہے کہ اگر اس تجویز کی حمایت کی گئی تو ان کا یہ منفعت بخش کاروبار ڈاؤن ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ دراصل نظام کی شفافیت سے گھبرا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر مدارس ملحق ہوجاتے ہیں تو ان ملحق مدارس کے اساتذہ کی تنخواہیں دیگر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے برابر ہونگی اور جب ایسا ہوگا تو دوسرے غیر ملحق مدارس کے ملازمین بھی تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کریں گے یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے مدارس کے ذمہ داران ہی مخالفت میں سامنے آئے ہیں اور چھوٹے مدارس اس کی حمایت میں ہیں پوری دہلی میں ایسے سیکڑوں مدارس ہیں جہاں کے نااہل ناظم، کم سواد مہتمم اور ان پڑھ انتظامیہ ان اداروں کو ''پرائیویٹ لمیٹیڈ کمپنی'' کی طرح چلا رہے ہیں عام اساتذہ سے لے کر پرنسپل تک کی تقرری میں اقربا پروری کا جذبہ غالب ہوتا ہے اور قوم کی گاڑھی کمائی کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوتا۔ مدرسہ بورڈ کی تشکیل ایسے لوگوں کے سروں پر ننگی تلوار ہوگی اور ان میں جوب دہی کا احساس پیدا ہوگا۔ اختلاف کرنے والوں کی بڑی تعداد وہ ہے جو مدرسہ بورڈ کے تصور سے پوری طرح واقف نہیں ہے اس لئے بغیر کسی منطق کے وہ لوگ یکسر اس کی مخالفت کررہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہماری قوم کو ایک پرانا مرض لاحق ہے وہ یہ کہ اگر ایک نے کوئی بات کہی اور خاص کر کسی منصب دار نے (جو کسی نہ کسی اعتبار سے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں) تو لوگ اپنی عقل لگانے کے بجائے ان کی پیروی کو پسند کرتے ہیں، جب کہ اسلام دین فطرت ہے، اس لئے یہاں عقل اور دانشمندی دونوں کو دخل ہے لیکن اتفاق سے جب بھی کوئی قومی مسئلہ آتا ہے تو یہ دونوں صفات بالائے طاق رکھ دیے جاتے ہیں۔ وہ حضرات جو مدرسہ بورڈ کے قیام کو اسلامی تشخص کو ختم کرنے کی منصوبہ بند کوشش قرار دے رہے ہیں آخر ان کے پاس اپنے موقف کے اثبات میں دلائل کیا ہیں؟ مدرسہ بورڈ کی مخالفت میں جو تحریریں شائع ہوئیں اور ہورہی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام دلائل 'امکانات' پر قائم ہیں۔ اس لئے مخالفین بورڈ کی تحریروں میں آپ کو ایسے جملے کثرت سے نظر آئیں گے کہ آج اختیاری مدرسہ بورڈ تشکیل دے بھی دیا جائے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہمیشہ کانگریس کی ہی سرکار اقتدار میں آتی رہے گی ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی فرقہ پرست پارٹی اقتدار میں آجائے اور وہ مدرسہ بورڈ کے ساتھ مدارس کے الحاق لازمی قرار دے دے۔ اسلامی تشخص متاثر ہوسکتا ہے۔ تعلیم متاثر ہوسکتی ہے۔ حکومت مدارس میں دخیل ہوسکتی ہے۔ مدارس کی آزادی اور خودمختاری ختم ہوسکتی ہے۔ نصاب تعلیم متاثر ہوسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ''ہوسکتا'' ہے کا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ مخالفت کی ساری عمارات امکانات پر کھڑی ہیں۔ برخلاف ان کے جو لوگ بورڈ کے قیام کے حق میں ہیں ان کے دلائل کی اساس زمینی حقائق پر قائم ہے جن سے مثبت نتائج کی آمد یقینی ہے۔ جو لوگ مدرسہ بورڈ کے قیام کی مخالفت میں سرگرداں ہیں ان کے ذمہ اس بنیادی اور اہم سوال کا جواب اس وقت تک رہے گا جب تک وہ اپنی مخالفت سے دست بردار نہیں ہوجاتے وہ یہ ہے کہ ملک کی مختلف ریاستوں میں جو مدرسہ بورڈ چل رہے ہیں جن سے ان کے مریدین اور معتقدین بھرپور استفادہ کررہے ہیں آخر ان کو ختم کرنے کی تحریک کیوں نہیں چلاتے؟ دہلی کے علاوہ دیگر ریاستی مدرسہ بورڈز کے تحت چل رہے ہزاروں مدارس کی منتظمہ کمیٹی سے اپیل کیوں نہیں کرتے کہ وہ بورڈ سے اپنا الحاق ختم کرلیں؟ اور آخر ان ریاستی بورڈز کے ذریعہ حکومت نے ایسا کیا کردیا جس سے مذکورہ مدارس کا اسلامی تشخص برقرار نہیں رہ سکا؟ اگر ایسا کچھ بھی نہیں تو پھر دیگر مدرسہ بورڈز کی طرز پر دہلی مدرسہ بورڈ کے قیام پر اتنا واویلا کیوں؟ بات کچھ نہیں صرف اتنی سی ہے کہ جو علما اونچے عہدوں پر بیٹھے

☆امام وخطیب قادری مسجد، دارالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی-25
ای میل: E-mail:manzar02011@gmail.com

آسائش میں زندگی گذار رہے ہیں اور جن کے نجی اداروں کی کفالت پٹرول کی دولت سے مالا مال عرب کی حکومتیں کر رہی ہیں انہیں ان عام علما کی ضرورتوں کا بالکل احساس نہیں، جن کی زندگی (آج کے اس مہنگائی کے دور میں بھی) صرف غیر معقول تنخواہوں پر گذرتی ہے۔ اور وہ مہتمم حضرات کی کاسہ لیسی کرتے ہیں، اگر چہ وہ کسی صلاحیت کے مالک نہ ہوں اور اس کی بنا پر بہت سے فضلا کو باصلاحیت ہونے کے باوجود نقصان اٹھانا پڑتا ہے وہ دربدر کی ٹھوکریں صرف اس بنا پر کھاتے ہیں کہ انہوں نے کسی صدر، سکریٹری، مہتمم کی چاپلوسی نہیں کی ۔ اور نہ ان مدارس کا خیال ہے جن کا استحکام حکومت کی مالی امداد پر منحصر ھے جہاں تک معیار تعلیم کا تعلق ھے تو اس کا کسی بورڈ سے الحاق پر کیا انحصار، یہ تو اس پر منحصر ہے کہ آپ کا نصاب تعلیم کیسا ہو، تعلیمی ادارے کے ذمہ داران اور اساتذہ کیسے ہیں، ان کی صلاحیتوں اور ان کی محنت وایمانداری پر موقوف ہے کہ بچوں کی کیسی تعلیم و تربیت کرتے ہیں بہت سے نظامیہ غیر ملحق مدرسوں معیار تعلیم انتہائی ناقص ہے اور کئی بورڈ سے ملحق مدرسوں معیار تعلیم بہت بلند ہے۔ اسی طرح سی بی ایس ای جیسے باوقار بورڈ کے بہت سے اسکولوں کا معیار تعلیم انتہائی ناقص ہے تو کیا اس کے لئے بورڈ ذمہ دار ہے؟ اخیر میں بڑے ادب کے ساتھ ہم تمام قائدین ملت اور دانشوران قوم کی خدمت یہ ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ سرکاری وسائل سے ہمارے مکاتیب و مدارس ان سے وابستہ اساتذہ، غیر تدریسی عملہ اگر چاہیں تو کیوں نہ بہرہ مند ہونے دیا جائے کیوں کہ مدرسہ بورڈ سے الحاق یا منظوری کا معاملہ اجباری نہیں اختیاری ہوتا ہے یہ زبردستی کا سودا نہیں طرفین کی رضامندی سے ہوتا ہے ۔ بورڈ سے الحاق تعلیمی ادارے کی درخواست پر ہوتا ہے اور منظوری ملنے کے بعد ادارے کے پاس الحاق کی منسوخی کا اختیار رہتا ہے بورڈ کا کام منظور شدہ نصاب کے مطابق امتحانات کا انعقاد اور اسناد کا اجراء ہے۔ اسی قانون کے تحت تمام بورڈ چل رہے ہیں۔

لہٰذا خدارا اسے مسلک ومشرب کی عینک سے نہ دیکھیں ورنہ ماضی میں جس طرح مرکزی مدرسہ بورڈ اور دیگر حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی مجموعی ترقی کی بہت سی اسکیمیں قائدین کے آپسی انتشار کی نظر ہوگئیں اگر آپ حضرات کی طرف سے اجتماعی اقدام نہیں کیے گئے تو دہلی مدرسہ بورڈ کا حشر بھی اگلوں سے مختلف نہیں ہوگا اور اس کی قیمت پوری قوم کو چکانی پڑے گی۔ اور شاید حکومت کی بھی یہی منشا ہے کہ اسکیم مسلمانوں کے آپسی اختلاف نظر ہو جائے ورنہ ملک کی مختلف ریاستوں میں پہلے سے ہی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، اسکول ایجوکیشن بورڈ، سی بی ایس ای بورڈ، یو جی سی بطور نمونہ چل رہے ہیں اسی نہج پر معمولی حذف واضافہ کے ساتھ دہلی مدرسہ بورڈ بنایا جا سکتا تھا۔ اس میں اتنی تحقیق وتفتیش اور مباحثوں کی ضرورت نہیں تھی مگر ایک دانستہ سازش کے تحت اس تجویز کو موضوع جنگ وجدال بنا دیا گیا اور پوری ملت اسلامیہ اس غیر ضروری بحث میں الجھ گئی۔ ◻◻

## بقیہ:—— تکثیری سماج اور اسلامی طرزِ زندگی

حالات میں اسلام ومسلمان کی حفاظت اور ان کی ثبات قدمی کے لیے ایمان وعقیدے کے تقاضوں کو واضح کیا گیا۔ مسلمانوں کو ان کے دائمی دشمنوں کی سازشوں، غلط منصوبوں اور مضرات سے آگاہ کیا گیا اور صبر و استقلال کے ساتھ مدافعت کرنے کی ترغیب دی گئی۔

آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دنیا میں کون سی ایسی حکومت یا مذہب ہے جو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بطانت (رازدارانہ دوستی) موالات (ہمدردی، سرپرستی، امداد واعانت) اور مودت دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی اجازت دے سکتا ہے۔ جو ہمہ وقت خون کے پیاسے ہوں۔ (بطانت وموالات اور مودت وغیرہ قرآنی اصطلاحات ہیں جو غیر مسلموں سے عدم تعلقات کے لیے استعمال ہوئے ہیں)۔

یہ ایک مخصوص صورت حال تھی جس میں ایسی ہدایتیں دی گئیں۔ اس کے برخلاف امن کی حالت میں غیر مسلموں سے بہتر روابط اور حسن سلوک سے منع نہیں کیا گیا۔ قرآن مقدس کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ تمھیں منع نہیں کرتا ہے ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل وانصاف اور احسان کا رویہ اختیار کرنے سے جنہوں نے تم سے دین کی وجہ سے جنگ نہیں کیا اور تمھیں تمہارے گھروں سے بے دخل نہیں کیا۔''
(سورہ ممتحنہ 9-7)

اسلام کے ان معتدل اور متوازن تعلیمات کے باوجود اسلام پر قدامت پسندی، علیحدگی پسندی اور جنگ جوئی کا الزام اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت اور شر پسند عناصر کی غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کا اثر ہے۔

اسلام چند سماجی رسم ورواج اور مذہبی معمولات کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مکمل اور آخری ضابطۂ حیات ہے جس میں ہمہ گیریت اور بے پناہ وسعت ہے، ہر زمان ومکان کے افراد یا جماعت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے، اس میں ہر حالات وتقاضے اور مسائل کا بہترین حل ہے۔ لیکن یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کی صحیح مدلولات واشارات کو اس کی عمومیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے میں ناکام ہیں۔ فقہی وفروعی اختلافات میں الجھ کر روح اسلام کو نظر انداز کر

پروفیسر سید سجاد حسین☆

# تمل ناڈو کا ایک نعت گو شاعر: علیم صبا نویدی

علیم صبا نویدی صوبہ تمل ناڈو کا ایک شہرۂ آفاق شاعر، بلند پایہ محقق اور بے باک نقاد ہے۔ وہ جدید لب ولہجہ کا شاعر ہے، اس کی شاعری میں عصری تقاضوں کی ترجمانی اور ذاتی تجرباتی واحساسات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ شعر وادب میں اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم رکھنے اور اپنے کلام کو تابانی عطا کرنے کے لیے کسی کے نور کا محتاج نہیں بلکہ اپنے ہی ذہن و دل کی ضوفشانی سے شعر وادب کی کائنات خود روشن کر لیتا ہے۔ وہ شعر وادب کے میدان میں تقلید پرستی کا قائل نہیں، خوشہ چینی اُس کے مزاج وفطرت کے منافی ہے۔ وہ انفرادیت کا حامل، جدیدیت کا علم بردار، نئی جہتوں کا متلاشی اورنت نئے تجربات کو شعر وادب میں روا رکھنے والا ایک عظیم فنکار ہے، جس کے شعری تجربات بقول رضا نقوی واہی: ''زیادہ وزنی، وسیع اور مجتہدانہ ہوتے ہیں۔'' ('شعاع شرق' ص 107، مطبوعہ 1987ء)

فکر و خیال کے نئے زاویوں کا تعین ہو یا فنّی قدروں کی شناخت کا مسئلہ، وہ دیدہ دلیری سے ان دشوار گزار راہوں کو اپنی شدتِ طلب سے نہ صرف ہموار بنا دیتا ہے بلکہ اپنے ارادوں سے حاصل ہونے والی روشنی سے تاریک منزلوں کو اُجاگر بھی کر دیتا ہے:

راہ کتنی ہی کٹھن ہو مگر اے پایۂ طلب
روشنی عزم کی کر دیتی ہے منزل روشن

صوبہ تمل ڈو میں اُردو شاعری کی روایت اور تاریخ کافی پرانی ہے۔ حضرت قربی ویلوری، حضرت ذوقی ویلوری اور حضرت لطیف آرکاٹی اس صوبہ کے متقدمین شعرا کی فہرست میں اہم مقام کے حامل ہیں اور اپنی ایک علاحدہ شناخت بھی رکھتے ہیں۔ ان شعرا نے اُردو شاعری کی روایت کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ سرزمینِ تمل ناڈو میں اس کی بنیادوں کو مستحکم بھی کیا۔ ان شعرا کا کلام بیشتر غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور تاریخ گوئی پر مشتمل ہے۔ نعتیہ کلام کے جو چیدہ چیدہ نمونے ان شعرا کے دیوان میں مل جاتے ہیں، اُن کو پڑھنے سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ نعت گوئی کو انھوں نے فنی اظہار کے لیے نہیں بلکہ حضور کی شانِ اقدس میں عقیدت مندی کا نذرانہ پیش کرنے کو اپنی سعادت اور نجات کا ذریعہ سمجھا۔ اس سے قطع نظر والا جاہی خاندان کے حکمرانوں اور نوابانِ آرکاٹ کے عہد میں یہاں شعر وادب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ کشتِ سخن کی آبیاری کے لیے اکثر و بیشتر شعرا نے غزل گوئی کو رواج دیا اور بعض شعرا نے مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور تاریخ گوئی کو اپنے مذاق کا نشانہ بنایا۔ والا جاہی خاندان کے چشم و چراغ اور تاجدارِ سلطنت نواب غلام غوث خان کے عہد میں لسان الحکمت نواب شاطر مدراسی، مولانا تجمل حسین خان ایمان گوپاموی ('قصائدِ ایمان' نعتوں سلاموں اور منقبتوں کا مجموعہ، مطبوعہ 1940ء) کے یہاں نعتیہ شاعری کے نمونے ہمیں مل جاتے ہیں، جو نہایت عقیدت وعزیمت اور روایتی اندازِ سخن کی غمازی کرتے ہیں۔ ان شعرا نے نعتیہ کلام کی صورت میں باضابطہ طور پر اپنا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں کیا۔ البتہ غزل گو شعرا کی ایک طویل فہرست مل جاتی ہے جنھوں نے نعت گوئی میں تبرکاً وعقیدتاً طبع آزمائی کی ہے۔ ایسے ہی جلیل القدر شعرا میں امیر الشعرا نواب محمد منور خان گوہر مدراسی، جناب سید شاہ محمد صبغۃ اللہ صاحب حسینی القادری نور مدراسی، جناب الحاج مرزا غلام عباس علی صاحب عباس مدراسی (فانوسِ خیال، مطبوعہ 1964ء)، افسر الشعرا جناب انصر الدین صاحب بیخود مدراسی، علامہ محوی صدیقی، جناب سید ابوالبرکات انور مدراسی، جناب پروفیسر حیدر علی خان حیدر (حاصلِ عمر، مطبوعہ 1976ء)، پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی، جناب آثم کرنولی، جناب حیرت القادری، منشی عبدالعزیز عادل مدراسی اور پروفیسر محبوب پاشاہ محبوب (متاعِ محبوب 1982ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جناب عادل مدراسی نے 'ریاضِ عقیدت' (مطبوعہ 1984ء) کے نام سے اپنا شعری مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعے میں نعتیہ کلام کے علاوہ مناقبِ المعصومین، سلام، اخلاقی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس لیے عادل مدراسی کے مجموعہ 'ریاضِ عقیدت' کو خالص نعتیہ کلام کا مجموعہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

خالص نعتیہ کلام کو (جو روایتی طرزِ اسلوب سے عبارت ہے) ترتیب دے کر شائع کرنے والے شعرا کی فہرست انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ شریف مدراسی نے اپنے نعتیہ کلام کو کتابچوں کی صورت میں شائع کیا۔ دانش فرازی ایک طویل نعتیہ نظم 'محسنِ اعظم' لکھ کر نعت گو شعرا کے زمرے سے وابستہ ہو گئے۔ عبداللہ شرقی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ نعت گوئی کے میدان میں ایک اضافے

☆ صدر شعبۂ اُردو، مدراس یونیورسٹی

کی حیثیت رکھتا ہے۔'رحمۃ للعالمین' فرید مدراسی کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ سہیل راشد کا مجموعہ'منزل نما' (مطبوعہ 1964ء) نعتیہ شاعری کی منزل کے تعین میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعقوب اسلم نے'رسولِ عربی' (مطبوعہ 1987ء) کو شائع کر کے نعت گو شاعر ہونے کا بھر پور ثبوت دیا ہے۔ راہی فدائی کا'مصداق' نعت اور جدید نظموں پر مشتمل ہے۔

صبا نویدی جو شعر و ادب کو جدید پیرایۂ بیان اور نت نئے تجربات سے ہم کنار کرنے کا قائل ہے، اختر الایمان کی طرح وہ بھی شاعری میں کامیابی کے لیے مذہبی تقدس کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس ضمن میں اختر الایمان کا کہنا ہے کہ:''شاعری میرے نزدیک کیا ہے؟ اگر میں اُسے ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں تو مذہب کا لفظ استعمال کروں گا۔ کوئی بھی کام جسے انسان ایمان داری سے کرنا چاہے اس میں جب تک تقدس نہ ہو جو صرف مذہب سے وابستہ ہے اس کام کے اچھا ہونے میں ہمیشہ شبہ کی گنجائش رہے گی۔'' (مجموعہ یادیں) چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صبا نویدی نے اختر الایمان کے اس بیان سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کو آفاقیت کی حدوں تک پہنچانے کے لیے نعت گوئی کو اپنی فکر و آہنگ کا محور بنایا اور چند ہی برسوں کے اندر یکے بعد دیگرے کئی نعتیہ شاعری کے مجموعے شائع کر دیے۔

'ترسیل' نظموں اور نعتیہ ہائیکو کا مجموعہ مطبوعہ 1986ء۔'شعاعِ شرق' خالص نعتیہ ہائیکو نظموں کا مجموعہ مطبوعہ 1987ء۔'مراۃ النور' نعتیہ کلام کا مجموعہ مطبوعہ 1988ء۔'نورالسمٰوات' اُردو زبان و ادب میں نعتیہ سانیٹ کا پہلا مجموعہ مطبوعہ 1989ء'ن' نعتیہ کلام کا مجموعہ مطبوعہ 1990ء۔

علیم صبا نویدی کے مذکورہ بالا مجموعوں کو دیکھنے کے بعد قاری اُس کے احساسات اور جذبات کی صالحیت، خیر و حسن اور صداقت پر ایمان ہی نہیں بلکہ اُسے ایک منفرد نعت گو شاعر کی حیثیت سے تسلیم بھی کرتا ہے۔ کیونکہ حمد و نعت جیسی قدیم اصناف کو اُس نے اظہار و شعور کے نئے انداز و سلیقے دیے اور اس میں وسعت و کشادگی پیدا کی۔ نیز اس نے حمد و نعت کی اصناف کی نئی شعری ہیئتوں کا لبادہ پہنا کر نعتیہ شاعری میں دوبارہ زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ عبدالمتین نے آزاد نظم میں اور کرم حیدری نے کثیر البحر پابند نظم میں نعتیں کہی ہیں۔ نئی نسل کے شاعروں میں اس نوعیت کے تجربے تحسین فراقی، راسخ عرفانی اور رشید قیصرانی بھی کر رہے ہیں۔ انور سدید، مظفر وارثی، حفیظ صدیقی، کوثر ناہید اور پروین شاکر وغیرہم نے بھی آزاد نظموں کی ہیئت میں حمدیں اور نعتیں کہی ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

نعت گوئی انتہائی مشکل اور معظم فن اور عبادت ہے۔ جتنی عظیم و مکرم وہ شخصیت ہے جس کے طفیل یہ وجود میں آئی۔ اس کی تصدیق اور اس کا اعتراف عرفی جیسے شاعر نے بھی کیا ہے جو اپنے پندار شاعری کے سامنے اور اپنے دعویٰ کی تائید میں رہ کر لوح و قلم کی شہادت پیش کرتا ہے لیکن نعت کی وادی میں قدم قدم پر اپنے کو باخبر رہنے کی تاکید کرتا ہے اور نعت کے فن کو تلوار کی دھار پر چلنے سے تعبیر کرتا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت ست نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بردم تیغ ست قدم را
ہُشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیح کے و جم را

یہ کچھ شاعروں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان کی مذہبی اور تہذیبی منزلت کا معیار یہ ہے کہ اس کی زندگی اور اس کا کردار کس حد تک عشقِ رسول سے مشرف و مستفیض ہے۔ عشقِ نبی کا تصور دراصل ہمارے ذہنوں میں میلاد ناموں اور میلاد خوانوں کا دیا ہوا تھا۔ حالی اور اقبال نے اس کو وہاں سے نکال کر مذہب و ملّت کے اعلیٰ اقدار و روایات کو سمجھنے، اُس پر عمل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا حوصلہ دیا۔ خدا اور رسول کے احکام کی اتباع اور اس پر عمل کرنے کی توفیق کلیۃً اللہ کی دین ہے لیکن ان اوامر اور نواہی کو بتانا اور دل نشیں کر دینا ان برگزیدہ شعرا کے حصّے میں آیا جن کے حروف شیریں کی طرف اقبال نے اپنے بے مثل پیرایۂ بیان میں اشارہ کیا ہے:

محمد بھی ترا جبرئیل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا

لہٰذا نعت گوئی وہ عظیم شاعری ہے جو بقول ڈاکٹر سید حامد حسین: گہری ارادت اور عقیدت کے تاثیرات سے تحریک پاتی ہے۔ اس میدان میں شاعر نہ تو اپنی فکر کو بے لگام چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی موضوعِ سخن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اسی لیے اچھی نعتیہ شاعری غزل کی روایتی شاعری سے کہیں مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے غزل گو شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جبکہ اچھے نعت گو شعرا کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

علیم صبا کا شمار بھی اُن معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی نعتیہ شاعری کے پے در پے مجموعے شائع کر کے ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام شعر و ادب کی دنیا میں تسلیم کروالیا ہے۔ اپنی سنجیدگیِ فکر، پاکیزگیِ خیال، تنوع پسند طبیعت اور تازہ کار اسلوب سے نعت جیسی انتہائی مشکل اور منظّم صنف میں بھی اس طوطیِ سخن نے اپنی آواز کی شناخت

قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

'ترسیلے' علیم صبا کے جدید انداز کی نعتوں پر مشتمل مجموعہ ہے جو قدیم جاپانی صنفِ شاعری 'ہائیکو' کے رنگ میں 1986ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں دو قسم کی ہائیکو نظمیں شامل ہیں۔ (1) پابند ہائیکو (2) نثری ہائیکو۔ اُردو میں صنف ہائیکو کو پہلی بار صبا نویدی نے نعت گوئی کے مقدس اظہار سے مالا مال کیا۔ 'شعاعِ شرق' 'ترسیلے' ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس میں تقریباً سارے کے سارے پابند ہائیکو شامل ہیں۔ صبا نویدی نے ہائیکو کے ایمائی اظہار سے فائدہ اُٹھا کر سرورِ کونین کی مدح سرائی میں اپنی عقیدت مندی و اخلاص کا اظہار ایک نئے انداز و اسلوب کے ساتھ کیا ہے۔ ہائیکو کی صورت میں پیش کردہ نعتوں میں ایک جامع اشاریت اور بلیغ رمزیت کا احساس ہوتا ہے، جو ہائیکو کی محاکاتی فضا کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ 'ترسیلے' اور 'شعاعِ شرق' میں شامل نعتوں میں شاعر اپنی جودتِ طبع سے اظہار کے نئے پیکر تراشتا اور ان کو اپنی مجتہدانہ کوششوں سے ایک نیا رنگ و رُوپ عطا کرتا ہے بالفاظ دیگر علیم صبا کے یہاں حمد و نعت کے مضامین جدت کی عبا اوڑھے ہوئے پورے تصدق کے ساتھ جلوہ گر ہیں:

آسمانوں کے بھید کا جوہر
سات عالم کے نور کا ماخذ
رونقِ کائنات کا مصدر

---

ایک سورج وجود میں آیا
آدمیت کی روشنی لے کر
نیک لمحہ وجود میں آیا

---

ذہن و دل کے سرورِ کا مرکز
نقش ہائے شعور سے آگے
محورِ لاشعور کا مرکز

---

آئینہ دار جوہرِ ہستی
اوج تابانی مہ و انجم
روز و شب کے جمال کی مستی

---

آپ کے ذکر میں قلم کا سر
جھک گیا بصد عقیدت سے
اور الفاظ ہوگئے ہیں گہر

---

آپ ہی آپ اوّل آخر
آپ کا فیض روزِ محشر تک
آپ کا نور ساتوں عالم پر

---

وہ ایک منبع علم و فن کا جلوس
ہے ارض و سما کی نگاہوں کا نور
سراپا تجلی سراپا خلوص

---

وہ خیر البشر ہے وہ خیر الامم
جمالِ شعور زمیں و آسماں
وہ ہے سب دھڑکتے دِلوں کا بھرم

---

وہ ہے ہر گہر کی چمک کا فلک
سمندر کے جلووں کا رمز آشنا
اُجاگر ہے جس سے صدف کی مہک

(شعاعِ شرق)

'مراۃ النور' صبا نویدی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جو 1988ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل نعتوں میں شاعر کی عقیدتِ رسول نے بھرپور تخلیقی اظہار پایا ہے۔ مدحتِ پیمبر اور عشقِ رسول میں سرشاری کو علیم دنیا و آخرت کے لیے وسیلۂ نجات اور ذاتِ کبریائی سے قربت کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہے:

یہ مدحتِ رسول یہ ذکرِ شہِ امم
بس اے صبا نویدی یہی زادِ راہ ہے

آزاد غزل، نثری نظم، ہائیکو، سانیٹ اور دوسری طرح طرح کے تجربے کرنے والا یہ شاعر جب نعت گوئی کی طرف رجوع ہوتا ہے تو سراپا عجز و انکساری بن کر اپنے فن و جوہر کی جلا پاشی ہی نہیں بلکہ اپنے نصیب کو بھی روشن کر لیتا ہے:

کیسا اٹوٹ آپ سے رشتہ ہے چاہ کا
روشن نصیب ہوگیا اپنی نگاہ کا
آپ کا نقشِ قدم چوم لیا جب سے
مجھ سے آگے نہ کبھی کوئی زمانہ نکلا
میں سراپا آئینہ ہوں آئینہ
میرا فن اور میرا جوہر ہیں نبی

1989 میں علیم صبا نویدی نے اُردو زبان و ادب میں نعتیہ سانیٹ کا پہلا مجموعہ 'نورالسمٰوات' کے زیرِ عنوان شائع کر کے سانیٹ کی ہیئت میں نعت کے موضوع کو نئے اسالیب میں ڈھالنے کا سہرا بھی اپنے ہی سر باندھا ہے۔ اپنے عہد کے پیرایۂ اظہار کو نعتیہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں جو سُرعت ورفتار صبا نویدی نے دکھائی ہے اس کے پیشِ نظر علی جواد زیدی کہتے ہیں:

''علیم صبا نویدی ہماری بے انتہا فعال اور توانا جنوب میں نئی شناختوں کے پرچم لہرا رہے ہیں اور ہماری غیر مقید حدود کو اُن وسعتوں سے آشنا کر رہے ہیں جو تامل ناڈو کی پیدا کردہ ہیں۔''

اور ڈاکٹر حفیظ اللہ نیول پوری اُس کی خلاّقانہ صلاحیتوں اور نئی تخلیقی فعالیت سے متاثر ہو کر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''علیم صبا نویدی کی ندرتِ تخیل اور تخلیقی سفر میں رکاوٹ اور تھکاوٹ کا شائبہ نہیں۔ جنوب کے اس مجذوب شاعر کو میں کھلی دُھوپ کا مسافر کہتا ہوں جو کسی سایۂ شجر کا مرہونِ منّت نہیں ہے، سفر اور مدام سفر کا قائل ہے۔''

''نورالسمٰوات'' کی نعتیہ سانیٹوں میں علیم صبا نویدی نے اپنے تخلیقی جوہر اور فن کارانہ صلاحیتوں کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ اس کی خلاّقانہ ذہنیت اور فنکارانہ تخیل کے باوجود اس کا عقیدت مند دل سراپا نیاز بن کر خاصۂ خاصانِ رسل کی مدحت سرائی میں اپنی بیکراں وارفتگی کے سبب گہری محویت اختیار کر لیتا ہے۔ ان نعتیہ سانیٹوں میں اس کی تخلیقی شخصیت کا متوازن، منظّم اور توانا پہلو واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ میرے اس بیان کی تصدیق کے لیے نعتیہ سانیٹ سے ماخوذ چیدہ چیدہ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

صاحب کون و مکاں سید لولاک ہیں وہ
ان سے ذہنوں میں تجلّی کا سماں پھیلا ہے
یہ زمیں پھیلی اُفق پھیلا جہاں پھیلا ہے
دونوں عالم کے لیے صاحب ادراک ہیں وہ

---

مرے فکر وفن کا ہے روشن ضمیر
مرے حوصلوں کی ہے اونچی اُڑان
ہے پاکیزہ سب سے مری آن بان
میں دربارِ احمد کا ہوں اِک فقیر
فقیری پہ اپنی مجھے ناز ہے
نرالا مرا شاہی انداز ہے

---

جذبۂ عشق محمد کا سفر ہے نوری
راہ برحسنِ اعظم کے معطّر جلوے
مہرباں ذاتِ مقدس کے منوّر جلوے
منزلیں جلوہ فشاں ، راہ گزرے ہے نوری
مدحتِ شاہِ زمن کا ہے نظارا ہر سو
پھول ہی پھول ہیں، جلووں سے لدی ہے خوشبو

---

شہنشاہِ دیں کا یہ فیضان ہے
یہ سانسوں کی دھڑکن لہو کا سفر
یہ ہونٹوں کی جنبش بیاں کے گہر
محمد کا ہر شئے پہ احسان ہے
محمد نہ ہوتے تو ہوتے نہ ہم
نہ اظہار ہوتا نہ نقشِ قلم

---

ذرّے ذرّے کو ملا حسنِ جمالِ دلبر
آبِ کوثر میں نہائے ہوئے آئے منظر!
زندگی کرنے لگی اُن کے ہی روضہ کا طواف
باوضو ذات ہوئی نیک ہوئے ہیں اوصاف

نعت گوئی کے دورانِ عشقِ احمد میں سرشاری کے لیے جو وارفتگی، عقل و فہم اور علم و آگہی مطلوب ہے صبا نویدی کی مذکورہ سانیٹ اس کی بولتی تصویر ہیں جن میں اخلاص و عاجزی کی صفات انتہائی عروج پر ہیں۔ اُس نے ایک نعت گو شاعر ہونے کی حیثیت سے خاصۂ خاصانِ رُسل صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی جس خلوص و محویت اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ کی ہے اُس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ علیم صبا کا نعتیہ کلام ہمارے لیے عہدِ حاضر کا ایک ایسا مقدس سرچشمہ ہے جس سے ملتِ اسلامیہ کے اندر رسول عربی سے والہانہ عقیدت مندی اور وارفتگی کا جذبہ بیدار ہو سکتا ہے۔ اور اسی جذبہ سے سرشار ہو کر ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد علیم کی طرح دین و دنیا میں ایک خوش نصیب اُمتی بن سکتا ہے:

سچ مچ صبا نویدی وہ خوش بخت ہیں بہت
خوابوں میں جن کی روشنیِ دل ہے آپ کی

□□

# حالیہ اسمبلی انتخابات اور الیکشن کمیشن

الیکشن کمیشن کا کردار کسی بھی انتخاب کے لیے کتنا کلیدی حیثیت رکھتا ھے یہ کسی سے مخفی نھیں۔ حالیہ اسمبلی انتخابات میں چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی صاحب کی سربراھی میں الیکشن کمیشن نے اپنا جو خصوصی کردار ادا کیا ھے وہ نہ صرف لائق تحسین ھے بلکہ مفید بھی ھے۔ انھوں نے انتخابی ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کے لیے جس طرح غیرجانب دارانہ طریقہ پر کوششیں کی ھیں وہ اس آئینی ادارہ کی مستعدی اور فرض شناسی کا اعلیٰ نمونہ ھیں۔ حکومت کو اس سلسلے میں چاھیے کہ وہ اس آئینی ادارہ کو مزید فعال اور متحرّک بنانے کے لیے مثبت اقدام کرے اور ایس وائی قریشی صاحب کے صاف و شفّاف کردار کے اعتراف میں مزید اختیارات و مناصب سپرد کرے۔ اب جب کہ اسمبلی انتخابات اختتام پذیر ھوچکے ھیں اور نتائج بھی سامنے آچکے ھیں ذیل میں حالیہ اسمبلی انتخابات میں الیکشن کمیشن کے خصوصی کردار پر مشتمل چند تحریریں پیش ھیں۔ (نوشاد عالم چشتی)

## الیکشن کمیشن: اختیارات کم نہ کرنے کا فیصلہ ایک مستحسن قدم

نافع قدوائی☆

مرکزی حکومت نے یہ صاف کردیا ہے کہ فی الحال اس کا کوئی ارادہ الیکشن کمیشن آف انڈیا کے اختیارات کو کم کرنے کا نہیں ہے۔ مرکزی حکومت نے یہ وضاحت اس وقت کی جب بعض حلقوں کی جانب سے پوری شدومد کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مرکزی حکومت الیکشن کمیشن آف انڈیا کے اختیارات کم کرنے جارہی ہے، جس کے تحت الیکشن کے ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کے اختیار کو الیکشن کمیشن سے لے کر عدلیہ کو سونپنے کی تیاری ہے۔ اس خبر کے پھیلتے ہی چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی نے اپنے سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ الیکشن کمیشن ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کا اختیار عدلیہ کو سونپے جانے کی ہر سطح پر مخالفت کرے گا۔ حکومت کا یہ قدم دراصل الیکشن کمیشن کے اختیارات کو کم کرنے والا ہے، جسے الیکشن کمیشن برداشت نہیں کرے گا۔ ایس وائی قریشی نے کہا کہ اگر ضابطہ اخلاق کے نفاذ کا اختیار عدلیہ کو دے دیا گیا تو ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے کے معاملات کئی کئی برس تک عدلیہ میں اُلجھ جائیں گے اور اس دوران ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے کے قصوروار سیاست داں تمام مراعات سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اور قصوروار اقتدار کے تمام مزے اٹھائیں گے۔ الیکشن کمیشن کے اختیارات کم کرنے کی بات ایک ایسے وقت میں کہی گئی یا پھیلائی گئی جبکہ پارلیمنٹ کا بجٹ اجلاس یکم مارچ سے شروع ہونے کو ہے اور حزب مخالف جس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی کارروائی کو کم سے کم چلنے دے، قبل اس کے کہ اس معاملہ پر حزب مخالف پارلیمنٹ میں ہنگامہ آرائی کرتا مرکزی حکومت نے اپنے موقف کو صاف کردیا ہے کہ فی الحال اس کا کوئی ارادہ الیکشن کمیشن کے اختیارات کو کم کرنے کا نہیں ہے۔ مرکزی حکومت کے اس قدم کو ایک دانش مندانہ قدم کہا جائے گا کہ اس نے حزب مخالف سے پارلیمنٹ میں ممکنہ ہنگامہ آرائی کے ایک ہتھیار کی دھار کو کند کردیا اور الیکشن کمیشن سے ممکنہ ٹکراؤ کو ٹال دیا ہے۔ مرکزی حکومت کے اس دانش مندانہ قدم کی بنا پر الیکشن کمیشن کی آئینی بالادستی برقرار رہی۔ جہاں تک الیکشن کمیشن کے ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کی بات ہے تو ابھی تک الیکشن کمیشن اس کے نفاذ میں کامیاب رہا ہے اور ملک کے عوام کی توقعات پر الیکشن کمیشن تقریباً کھرا اترا ہے۔ ایسے میں اگر مرکزی حکومت الیکشن کمیشن سے چھیڑ خانی کرتی تو اس سے مرکز کو فائدے سے زیادہ نقصان ہی اٹھانا پڑتا۔ ابھی ریاست اتر پردیش سمیت ملک کی پانچ ریاستوں میں ہورہے الیکشن میں الیکشن کمیشن نے پوری سختی کے ساتھ ضابطہ اخلاق کا نفاذ کیا، جس کے نتیجہ میں اُتر پردیش میں الیکشن کمیشن آف انڈیا اور مرکزی وزیر سلمان خورشید، بینی پرسادورما کے مابین لفظی جنگ بھی ہوئی۔ ان دونوں وزراء نے یوپی الیکشن کے دوران اقلیتوں خاص طور پر پسماندہ مسلمانوں کو ساڑھے چار فیصد ریزرویشن دینے کی بات کہی، جسے الیکشن کمیشن نے ضابطہ اخلاق کی صریح خلاف ورزی گردانا۔ ابتدا میں مرکزی وزیر قانون سلمان خورشید اس معاملہ میں الیکشن کمیشن سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار تھے۔ انھوں نے ایک سے زائد مرتبہ الیکشن کمیشن کی بالادستی کو چیلنج کیا۔ الیکشن کمیشن نے بھی ان کے خلاف سخت موقف اختیار کیا اور معاملہ صدر جمہوریہ ہند کے دربار تک پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب الیکشن کمیشن نے کسی مرکزی وزیر کے خلاف صدر جمہوریہ کے یہاں شکایت کی ہو، قبل اس

کے معاملہ اورزیادہ طول پکڑتا سلمان خورشید نے الیکشن کمیشن سے معافی مانگ کر معاملہ کوختم کرایا،اس کے بعد مرکزی وزیر بینی پرساد ورما نے سلمان خورشید کے مسلم ریزرویشن کے بیان کودوہراکرالیکشن کمیشن کی بالادستی کوچیلنج کیا،جس پرکمیشن نے انھیں نوٹس جاری کیا،اگرچہ بینی پرساد ورمانے یہ واضح کردیا ہے کہ ان کا مقصد ہرگز الیکشن کمیشن کی بالادستی کوچیلنج کرنے کانہیں ہے۔مرکزی وزراءسمیت تمام سیاست دانوں کے ضابطہ اخلاق کی خلافِ ورزی کرنے کے معاملات پرالیکشن کمیشن کے تحت موقف کو ہمیشہ ملک کے عوام نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے قومی صدر نتن گڈکری کواپنا عہدہ سنبھالے ہوئے کئی ماہ ہوچکے ہیں،لیکن ابھی تک وہ اپنی پارٹی پراپنی گرفت مضبوط نہیں کرسکے ہیں۔بی جے پی کے لیڈروں،ریاستی اکائیوں میں بےچینی بڑھتی جارہی ہے۔بی جے پی کی اقتدار والی ریاست کرناٹک میں پارٹی کا بُرا حال ہے۔ایک طرف یہاں پارٹی بدعنوانیوں کے معالات میں صفائی دیتی پھررہی ہے،دوسری جانب گزشتہ دنوں کرناٹک اسمبلی کے اجلاس کے دوران وزیراعلیٰ سدانند گوڑا کے تین وزراءایوان میں انتہائی فحش،عریاں ویڈیو، دیکھتے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے،جس سے پارٹی کو سخت شرمندگی اورخفت اٹھانی پڑی،اگرچہ پارٹی کی مرکزی قیادت کے ایماپروزیر اعلیٰ سدانند گوڑا نے اپنے ان بےشرم وزراءکووزارتی کونسل سے ہٹادیا ہے،لیکن اس سے پارٹی کوجونقصان ہوااس کی بھرپائی پارٹی کے لیے آسان نہیں ہے۔

کرناٹک کے سابق وزیراعلیٰ یدی یورپا جنھیں گزشتہ دنوں کروڑوں روپے کی کان کنی کھدائی کے گھپلے میں ملوث ہونے کے بعد وزیراعلیٰ کے عہدے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا،اب کچھ روز کی خاموشی کے بعد یدی یورپا نے بی جے پی کی مرکزی قیادت سے وزیراعلیٰ کی کرسی پرانھیں دوبارہ بٹھانے کا مطالبہ کرکے مرکزی قیادت کے لیے مشکلات پیدا کردی ہیں۔یدی یورپا جوان دنوں نئی دہلی میں ہیں۔انھوں نے اپنے حامی ممبران اسمبلی کو ہدایت دی ہے کہ بی جے پی قیادت پر ہرطرح کادباؤ ڈالیں کہ یدی یورپا کوکرناٹک کا وزیراعلیٰ بنایا جائے۔سابق وزیراعلیٰ یدی یورپا نے پارٹی کی قیادت کوآگاہ کردیا ہے کہ وہ ان کے مطالبے پر 27/فروری تک فیصلہ کرلے،بہ صورت دیگروہ اس سلسلے میں اپنا اگلا قدم اٹھانے کے لیے آزاد ہوں گے۔یدی یورپا نے یہ آگاہی اس وقت دی جب نتن گڈکری کرناٹک میں پارٹی کے کارکنوں کے خوداحتسابی کیمپ کوخطاب کرنے کے لیے آئے۔کرناٹک بی جے پی میں ہی بےچینی نہیں ہے، بلکہ گجرات کے وزیراعلیٰ نریندرمودی بھی پارٹی کی قیادت سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔نریندرمودی اُترپردیش،اتراکھنڈاسمبلی انتخابات کی مہم میں حصہ لینے کے خواہش مند تھے،لیکن پارٹی کی مرکزی قیادت نے نہ توان کی خدمات اتراکھنڈاسمبلی انتخابات کی مہم میں حصہ لینے کے خواہش مند تھے،لیکن پارٹی کی مرکزی قیادت نے نہ تو ان کی خدمات اتراکھنڈاسمبلی انتخابات میں لی ہیں نہ ان کی خدمات ابھی تک یوپی اسمبلی انتخابات میں لی ہیں، جہاں سات مرحلوں میں سے پانچ مرحلوں کی پولنگ ہوچکی ہے۔نریندرمودی کی دلی خواہش ہے کہ پارٹی ان کوآئندہ وزیراعظم کے طورپرپیش کرے،لیکن پارٹی کی مرکزی قیادت نریندرمودی کے اس سیاسی عزم کو پوراکرنے کےحق میں نہیں ہے،جس سے نریندرمودی اور پارٹی میں ایک طرح کی سرد جنگ شروع ہوگئی ہے۔اترپردیش میں بی جے پی کی ڈوبتی کشتی کو پارکرانے کے لیے پارٹی مدھیہ پردیش کی سابق وزیراعلیٰ اوما بھارتی کونہ صرف اترپردیش لائی بلکہ پارٹی نے اُوما بھارتی کو پھراسمبلی الیکشن کے میدان میں اُتارا۔اُوما بھارتی کے بڑھتے عمل دخل کوخود یوپی بی جے پی کے متعدد لیڈروں نے پسند نہیں کیا۔نتیجہ میں اُوما بھارتی کبھی بھی یوپی بی جے پی کی مقبول لیڈر نہیں بن سکیں۔

انڈین یونین مسلم لیگ ایک طرف عام مسلمانوں میں یہ پروپیگنڈہ کرتی رہی ہے کہ بی جے پی مسلم مخالف ہے،اس لیے اس پارٹی سے مسلمان دورکا بھی واسطہ نہ رکھیں۔دوسری جانب خودانڈین مسلم لیگ کی بابت بی جے پی ہمیشہ سے یہ کہتی آئی ہے کہ مسلم لیگ کی ذہنیت رکھنے والوں نے ہی پاکستان بنوایا اورمسلم لیگ ذہنیت رکھنے والوں نے ہی پاکستان بنوایا اورمسلم لیگ ذہنیت رکھنے والوں کی بی جے پی سخت مخالف ہے،لیکن (ناگپور) ممبئی کے میونسپل کارپوریشن کے الیکشن میں واضح اکثریت کے ساتھ بدستوراقتدار کرنے کے لیے بی جے پی اور مسلم لیگ کے ارکان ایک ہوگئے ہیں۔حالانکہ ناگپورمیونسپل کارپوریشن میں انڈین مسلم لیگ کے صرف دوارکان ہی ہیں۔145/رکنی ایوان میں بی جے پی کو واضح اکثریت کے لیے 75 ممبران کی ضرورت ہے۔الیکشن میں تنہا اس کے ارکان کی تعداد 62 /اور گیارہ اس کے حلیف ارکان کی تعداد ہے،کل ملاکر 173/ارکان ہوتے ہیں،ایسے میں دوانڈین مسلم لیگ کےارکان کی حمایت ملنے سے یہ تعداد 75 تک پہنچ جائے گی۔اس طرح سے بی جے پی کوواضح اکثریت حاصل ہوجائے گی۔اقتدار کے لیے بی جے پی کیسے کیسے سمجھوتے کرتی ہے اور انڈین مسلم لیگ مسلمانوں سے کہتی کچھ اور ہے اور کرتی ہے کچھ اور، اس کی بدترین مثال ان دونوں پارٹیوں کے مابین اتحاد ہے۔گزشتہ روز سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں جمہوری اقدار و روایات پرحملہ کے مقدمہ میں یوگ گروبابا رام دیواور دہلی پولیس دونوں کوقصوروارٹھہرایا ہے۔سپریم کورٹ کی ڈویزن بنچ جومسٹرجسٹس بی ایس چوہان اورمسٹرجسٹس سوتنتر کمار پرمشتمل تھی اپنے فیصلے میں کہا کہ 6/جون 2011ءکونئی دہلی کے رام لیلا میدان میں یوگ گرورام دیواوران کے حامیوں نے کالے دھن کی واپسی کے مطالبے پر جودھرنا ومظاہرہ کیااورجس میں تشدد بھڑک اٹھااور پولیس نے طاقت کا استعمال کیا۔□□

(بشکریہ روزنامہ انقلاب،27فروری 2012)

فضل الرحمٰن☆

# الیکشن کمیشن کو مستحکم کریں، کمزور نہیں

## اس آئینی ادارہ کی معنویت بھی ہے جب ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والوں سے سختی سے نپٹا جائے

آخر کار مرکزی وزیر سلمان خورشید کو الیکشن کمیشن سے معافی مانگنی پڑی۔ الیکشن کمیشن ایک اہم آئینی ادارہ ہے اور اس کی حیثیت کم کرنے کی کوشش افسوسناک ہے۔ سلمان خورشید مرکزی وزیر ہیں، اس لیے ان سے زیادہ ذمہ داری کی امید تھی، مگر انھوں نے یکے بعد دیگرے عوامی جلسوں میں ایسی باتیں کہیں جس پر الیکشن کمیشن کی بھنویں تن گئیں۔ سب سے پہلے مرکزی وزیر نے اعظم گڑھ میں عوامی جلسہ کے دوران بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی تصویریں دیکھ کر سونیا گاندھی کے اشک بار ہونے کا قصہ چھیڑا، اور پھر فرخ آباد میں مسلم ریزرویشن کے لیے پھانسی پر لٹک جانے کی بات کہی۔ ان دونوں واقعات سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ جس طرح بی جے پی مندر اور مسلم ریزرویشن کے ایشوز کو اٹھا کر ووٹروں کو گمراہ کرنے اور انھیں اپنے حق میں رام کرنے کی کوشش کررہی ہے، اسی طرح کا کام کانگریس کے مرکزی وزیر بھی کررہے ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اقتدار میں رہ کر کسی طرح سیاستداں زمینی حقیقتوں اور جمہور عوام سے کٹ جاتے ہیں۔ انھیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ عوام دراصل چاہتے کیا ہیں۔ مسلمانوں کو بہکانے اور گمراہ کرنے کی کوششیں ہر عام انتخابات کی طرح اس بار بھی خوب کی جارہی ہیں، دوسری طرف یہ بات بھی عوامی گفتگو میں اُبھر کر سامنے آرہی ہے کہ عوام اس طرح کی باتوں سے عاجز آچکے ہیں۔ انھیں سڑک، بجلی، پانی، صحت، تعلیم اور روزگار چاہیے، جھوٹ موٹ کے دلاسے، جذباتی بیانات اور دلفریب وعدے نہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت دوہری مار جھیل رہے ہیں۔ ایک طرف بی جے پی اور سنگھ پریوار کے لوگ انھیں ہر وقت نشانے پر لیے رہتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں سے متعلق امور پر کوئی ٹھوس اقدام کرنے کے بجائے کانگریسی لیڈران جذباتی ایشوز میں انھیں اُلجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ حکمراں جماعت ہو یا اپوزیشن، ان کے لیے الیکشن صرف ووٹوں کے حصول کا موقع نہیں ہونا چاہیے۔ الیکشن کے ایام میں سیاسی لیڈران کو اپنے حلقہ کے سبھی علاقوں میں جانے اور عوام کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ پالیسی اور سازی میں اس تجربہ کو مثبت طریقہ سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک طبقہ کے لوگوں کو محض ووٹ بینک سمجھنے اور انھیں بے وقوف بنانے کے رجحان سے جمہوریت کے تئیں عوام کا اعتماد متزلزل ہوگا، اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

الیکشن کمیشن کی اہمیت کیا ہے، اس کا احساس پہلی بار ۹۰ کی دہائی میں اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر ٹی این سیشن نے کرایا تھا، جن کے آگے اس وقت کے وزیر اعظم پی وی نرسمہاراؤ کو بھی جھکنے پر ہونا پڑا تھا۔ الیکشن کمیشن جیسے اہم ادارہ کی طرح کام کرنے دیا جائے۔ مرکزی الیکشن کمیشن یہ بھی کرسکتا تھا کہ سلمان خورشید کو ان کی اہلیہ کے اسمبلی حلقہ میں تشہیری مہم چلانے سے روک دے۔ مگر کمیشن نے کوئی کارروائی نہ کرکے صدر جمہوریہ کو خط لکھ کر بظاہر نرم رویہ اپنایا۔ ایسے حالات میں جب قانون کی خلاف ورزی خود قانون سازوں کے ذریعہ کی جارہی ہو، سخت پیغام دینے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ گزشتہ روز ہی الیکشن کمیشن کے حکم پر اترپردیش میں 11 افسروں کا تبادلہ کردیا گیا جس میں ضلع مجسٹریٹ رائے بریلی بھی شامل ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو سیاستداں اور افسر شاہ ایک ہی پالے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ الیکشن کے دوران حکومت کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنے والوں کا تبادلہ تو لازمی تھا ہی، قانون کی خلاف ورزی کرنے والے لیڈروں سے بھی سختی سے نپٹا جانا چاہیے۔ الیکشن کمیشن اب تک دو درجن ایسے افسروں اور ملازمین کے خلاف کارروائی کرچکا ہے جو صاف شفّاف اور منصفانہ انتخابات کی عمل میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ افسر شاہی اور سیاست دانوں کی ملی بھگت کیا کیا گل کھلاتی ہے اس کے لیے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بدعنوانی ہو یا فرقہ وارانہ فساد، جرائم ہوں یا عوامی رقوم کی لوٹ کھسوٹ ان سب معاملات میں جمہوریت کے مذکورہ دونوں ستون بعض مواقع پر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر عدلیہ تک کو بے وقوف بنانے سے باز نہیں رہتے۔ الیکشن کمیشن کو یہ ہدایت جاری کرنی چاہیے کہ حکومت کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنے والے انتظامیہ اور پولیس کے اہلکاروں پر الیکشن کے بعد بھی نظر رکھی جائے اور ذمہ دار عہدوں پر ان کی تقرری پر پابندی لگے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کیونکہ جس طرح سیاست میں جرائم کی آمیزش ہوئی ہے، اسی طرح افسر شاہی کو سیاست زدہ کرنے کی بھی بھرپور کوششیں ہوئی ہیں اور اس بات کی امید کم ہی ہے کہ سیاسی پارٹیاں یا حکومتیں، افسر شاہی کو اپنے مطلب کے لیے استعمال نہیں کریں گی، لہٰذا اس سلسلہ میں افسر شاہی کے سیاسی استعمال کے رجحان پر روک لگانے کے لیے قانون سازی ضروری ہے۔ الیکشن کمیشن کو ٹی این سیشن کا دور یاد رکھنا چاہیے اور سیاست داں ہوں یا نوکر شاہ، اتنی لچک نہیں دینی چاہیے کہ وہ ضابطہ اخلاق کا مذاق اُڑانے لگیں۔ ❑❑

(بشکریہ روزنامہ انقلاب، 15 فروری 2012)

☆ ای میل: fazlurrehman@inquilab.com

# انتخابی کمیشن اور سیاسی جماعتیں

ایک طرف تو بی جے پی یہ شور مچاتی ہے کہ الیکشن کمیشن کا رویہ حکمراں طبقے کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ نہیں ہے جب کہ دوسری جانب کمیشن کے رول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس اور اس کی اتحادی جماعتیں اس ادارہ کے نرغہ میں آ چکی ہیں اور ضابطۂ اخلاق کی صریح خلاف ورزیوں کے معاملہ میں ان کی مشکلیں مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ گرچہ اپنی جگہ درست ہے کہ کانگریس کی پریشانی خود اس کی پیدا کردہ وہ ہے جس کے لیے کوئی دوسرا نہیں خود پارٹی ہی ذمہ دار ہے لیکن انتخابی کمیشن کے ذریعہ تادیب کی جو بھی تلوار لٹکی یا لٹکائی جا رہی ہے، وہ یقینی اعتبار سے انتخابی عمل کو صاف وشفاف بنانے اور غیر جانبدارانہ صورتحال کو برقرار رکھنے میں معاون ومددگار بن رہی ہے۔ اب اسے کیا کہا جائے کہ یوپی کی انتخابی مہم کے دوران ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزیوں کے ہزاروں مقدمات درج کیے جا چکے ہیں اور شکایت کے اندراج کا لامتناہی سلسلہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ شکایت کے شکار بننے والوں میں حکمراں جماعت کے کلیدی رہنما بھی شامل ہو گئے ہیں۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری راہل گاندھی کا روڈ شو تنازعہ کی زد میں آ چکا ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ضابطۂ اخلاق کی پامالیاں کسی بھی لحاظ سے الیکشن کمیشن کے لیے قابل برداشت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں شکایت درج کر لی گئی ہے اور ضابطہ کے تحت کارروائی کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔

اس سے قبل کانگریس سے تعلق رکھنے والے دو مرکزی وزرا سلمان خورشید اور بنی پرساد ورما الیکشن کمیشن کے دام میں گرفتار ہو چکے تھے۔ معافی تلافی کے ذریعہ اوّل الذکر وزیر کو نجات مل چکی ہے جبکہ آخر الذکر کی وضاحت داخل دفتر کی جا چکی ہے جس پر ابھی الیکشن کمیشن کو فیصلہ لینا باقی ہے۔ اب اس بدقسمتی کو کیا کہا جائے کہ ابھی ان دونوں مرکزی وزرا کے خلاف درج ہونے والی شکایات کا باب الیکشن نے بند بھی نہیں کیا تھا کہ تیسری شکایت راہل گاندھی کے روڈ شو کے حوالے سے درج کی گئی ہے جس میں آگے کی کارروائی ہونا باقی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ کانگریس کی ایل ڈی بھی نشانے پر ہے، جس میں گمان ظاہر کیا جا رہا ہے کہ چودھری اجیت سنگھ کے صاحبزادہ جینت چودھری کی مشکلیں بڑھ سکتی ہیں۔ اس صورتحال کو پیش نظر رکھ کر یہ خیال ظاہر کرنے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں کہ الیکشن کمیشن نے انتخابی ضابطۂ اخلاق کی پاسداری کے لیے غیر جانبدارانہ نہج پر کوششیں انجام دی ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو آزاد ہندوستان کی تاریخ میں غالباً پہلی بار کسی مرکزی وزیر کی شکایت صدر جمہوریہ ہند سے نہیں کی جاتی اور یوں صدر جمہوریہ کا دفتر شکایتی فائل وزیر اعظم دفتر کو نہ بھیجا۔ یہ الیکشن کمیشن کی مستعدی، جوابدہی، ذمہ داری اور فرض شناسی کا زندہ جاوید نمونہ ہے کہ اس نے عہدوں اور مرتبوں کا لحاظ کئے بغیر جائز شکایات کی روشنی میں تادیبی کارروائی کو یقینی بنانے کی کوشش کی۔ ایسی صورت میں حزب مخالف جماعتوں کے اس الزام کو حق بجانب ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا جس میں بار بار این ڈی اے میں شریک جماعتیں بالخصوص اور مرکزی حکومت کے خلاف محاذ آراء جماعتیں بالعموم الیکشن کمیشن کے طرز عمل پر انگشت نمائی کرتی رہی ہیں۔ الیکشن کمیشن ایک آئینی ادارہ جس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بلا اختصاص قانون شکن افراد اور جماعتوں کے خلاف ضابطے کے تحت کارروائی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آئینی ادارے کا بھرم رکھتے ہوئے پوری ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس وقت سیاسی جماعتوں کے درمیان بے چینی کا عام احساس پایا جاتا ہے۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ خود بی جے پی کے خلاف الیکشن کمیشن میں شکایات درج کی جا چکی ہے جس کے تحت پارٹی صدر نتن گڈکری کو نوٹس بھی جاری کی جا چکی ہے کہ انھوں نے غیر ضروری طور پر انتخابی جلسوں اور اپنے انتخابی منشور میں رام مندر کی تعمیر کی بات کیوں کی؟ یہ بھی حسن اتفاق ہی ہے کہ الیکشن کمیشن میں شکایت درج کرانے والوں میں ہندو مہا سبھا اور دوسری سادھو سنتوں کی تنظیم ہی شامل ہے جس نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ پارٹی کا رویہ اور نظریہ انتخابی ضابطۂ اخلاق کی پامالی کا سبب بن رہا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ رام مندر اور بابری مسجد کا تنازعہ عدالتی توجہ کا منتظر ہو، مندر کی تعمیر کی یقین دہانی اور اس پر سیاست کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا بی جے پی اور اس کے نظریہ سازوں کو ہندوستانی عدالتی نظام پر اعتماد نہیں؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے کیونکہ جب کوئی معاملہ عدالت میں زیر غور ہو تو اس پر کسی بھی طرح کی پیش رفت کا کھلم کھلا اعلان درست ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو عدالت کی توہین وتضحیک کے ہی مترادف ہے کہ عدلیہ کا فیصلہ آنے سے قبل کوئی فریق اپنے مستقبل کا تعین کر لے۔ بادی النظر میں بی جے پی کے انتخابی منشور میں کیا گیا رام مندر کی تعمیر کا فیصلہ یا یقین دہانی راست طور پر عدالت سے متصادم قدم ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے الیکشن کمیشن میں شکایت پہنچنا اور پھر کمیشن کا حرکت میں آنا خلاف واقعہ نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ بی جے پی اور اس کی اتحادی جماعتیں برسر اقتدار طبقہ کو ہدف تنقید بناتے ہوئے جس طرح الیکشن کمیشن کو بدنام کرنے میں منہمک ہیں، وہ کیا 'چور مچائے شور' کے مترادف نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پارٹی کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ الیکشن کمیشن اس کی خبر لینے والا ہے اور اس سے پارٹی کی مشکلیں بڑھ سکتی ہیں لہٰذا وہ اسی وجہ سے گمراہ کن پروپیگنڈہ تو نہیں کر رہی ہے؟ جو بھی ہو اتنی بات تو طے ہے کہ الیکشن کمیشن پر بے ہودہ الزامات عائد کرنا کسی بھی لحاظ سے قابلِ برداشت قدم قرار نہیں پاتا۔ اس سلسلے میں کمیشن کو چاہیے کہ وہ دو قدم اور آگے بڑھے اور ایسے سیاسی لیڈران کی گردن میں قانون کا پھندا ڈالے جو اس آئینی ادارہ کی حرمت کا خیال رکھنے کی بجائے اسے بدنام کرنے کی دانستہ کوششوں میں مصروف ومشغول ہیں۔ بہرحال دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ کمیشن اس سلسلے میں مزید کیا پیش رفت دکھاتا ہے اور سیاست دانوں کا ناطقہ کن کن صورتوں میں بند ہوتا ہے؟ ❑❑

(بشکریہ ہندوستان ایکسپریس، 22 فروری 2012 کالم اداریہ)

خصوصی موضوع

محمد صابر رضا رہبر مصباحی☆

# ایس، وائی قریشی کی قیادت والی الیکشن کمیشن اور حالیہ اسمبلی الیکشن

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوریت میں عوام کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ دوڑ ہوتی ہے یعنی عوام اپنے پسند کے نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں جو حکومت کی زمام تھامتے ہیں۔ دنیا کے تمام جمہوریت کے حامل ممالک میں اس کا یکساں طریقہ رائج ہے وہ ہے ووٹنگ کا طریقہ ہے۔ بے خوف وشفاف ماحول میں ووٹنگ کرانے کے لیے باضابطہ ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی ہے جس کا نام انتخابی کمیشن ہے۔ اسے وہ ہر ایک آئینی حقوق حاصل ہے جس کے ذریعہ وہ پر امن ماحول میں غیر جانبدارانہ طور پر انتخابات کرا سکے۔ اس کے لیے کچھ اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں کیوں کہ آزاد، منصفانہ اور بے باکی سے کیا جانے والے انتخابات ہی جمہوریت کی اصل طاقت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دستور ہند میں تمام دباؤ سے آزاد انتخابی کمیشن کا قائم کیا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین ساز اسمبلی میں مذکورہ تجویز پیش کی اور کہا کہ آزادانہ ماحول میں انتخابات کرانا اور انتخابات میں عاملہ کی مداخلت نہ ہونے دینا ایک بنیادی حق ہے۔ اجلاس میں موجود تمام نمائندوں نے تفاق رائے کے ساتھ ڈاکٹر امبیڈکر کی اس تجویز کو قبول کر کے اپنی حمایت کا اعلان کیا، لیکن جیسے جیسے حالات بدلتے گئے اور سیاسی پارٹیوں میں اقتدار کی بھوک شدت اختیار کرتی گئی الیکشن کمیشن کے اختیارات پر مختلف طریقوں سے شب خون مارنے کی کوشش بھی جاری رہی ہے۔ کیوں کہ الیکشن کمیشن کی غیر جانبداری کے سبب اقتدار بھوکی پارٹیوں کو اپنی سیاسی روٹی سینکنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں ان کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے وہ یقینی طور پر غیر جانبدارانہ اور بے باکانہ ماحول میں ہی ہوئے ہیں لیکن ماضی کی بہ نسبت کمیشن کی حالیہ کارکردگی کے پیش نظر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایس وائی قریشی کی قیادت والی کمیشن نے اس پہلو کو بخوبی نبھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیشن نے اب تک انتخابی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کی پاداش میں تقریباً 167 افراد کے خلاف نوٹس جاری کیا ہے جن میں مرکزی وزیر قانون سلمان خورشید اور بینی پرساد سمیت متعدد چوٹی کے لیڈران شامل ہیں۔ یہی نہیں آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار الیکشن کمیشن کو کسی وزیر کے خلاف صدر جمہوریہ کو خط لکھ کر کارروائی کی سفارش کرنی پڑ رہی ہے۔ الیکشن کمیشن کے سخت تیور سے پریشان کانگریس نے غلطیوں سے توبہ کرنے کے بجائے الیکشن کمیشن کے پر کو ہی کاٹنے کے راہ تراشنے لگی ہے۔ کمیشن کا مثالی ضابطہ اخلاق اس کی آنکھوں میں خار بن کر چبھنے لگا ہے۔ یہی ہے کہ مرکزی وزیر خزانہ جناب پرنب مکھرجی کی قیادت والی وزراء گروپ کی میٹنگ کے ایجنڈے میں یہ شامل تھا کہ الیکشن کمیشن کے اختیارات کو کم کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب اس کی بھنک میڈیا کو لگی تو سلمان خورشید سمیت دیگر وزراء بھی اس سے انکار کرنے لگے ہیں حالانکہ وزرا گروپ کی میٹنگ کے ایجنڈہ نمبر 3 اس کا ذکر ہے۔ یہی نہیں وزراء گروپ کے صدر کا کہنا ہے کہ ترقی کی راہ میں مثالی ضابطہ اخلاق سب سے بڑی روکاٹ ہے۔ یہ الیکشن کمیشن پر شب خون مارنے کی کانگریس کی یہ کوئی پہلی کوشش نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی جون 1975ء میں اس طرح کی کوشش ہو چکی ہے جب سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کی رائے بریلی پارلیمانی نشست سے انتخاب لڑی تھیں اور اس میں بھاری بدامنی ہوئی تھی اور الہ آباد ہائی کورٹ نے اس الیکشن کو غیر قانونی پایا۔ جس کے بعد آنجہانی گاندھی سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا جانے لگا پھر انہوں نے حقیقت کو قبول کرنے کی بجائے ملک میں ایمرجنسی لگا یا دیا اور اس طرح 42 ویں آئینی ترمیم کے ذریعے وزیر اعظم کے پارلیمانی حلقہ کے چناؤ کو عدالتی چیلنج سے آزاد کرا لیا گیا نیز عدالتی نظر ثانی کے حقوق بھی کم کر دیئے گئے۔ کانگریس ہمیشہ اپنی خواہش کے مطابق الیکشن کمیشن چاہتی رہی ہے۔ اس کا ثبوت ملک کا نواں عام انتخابات ہے جس کے ٹھیک ایک ہفتے پہلے 10/ اکتوبر 1989ء کو اس نے الیکشن کمیشن کی ایک رکنی نظام کی جگہ دو اضافی رکن جوڑے دیے۔ کیوں کہ تین میں سے ایک نہ ایک تو ضرور اس کا نمک حلال ثابت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کانگریس حکومت کے اس فیصلے کی سخت نکتہ چینی گئی لیکن کانگریس کو اس سے کیا مطلب بس اقتدار کی کرسی پر قبضہ جمانے کی فکر ہے چاہے جس طرح سے ممکن ہو۔ حالاں کہ ایسی روش کسی بھی جمہوری ملک کے لئے زہر ہلال ہے۔ کیوں کہ اس طرح سے جمہوریت کا پنپنا مشکل ہے۔ ❑❑

☆ ریزیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ سنگم پٹنہ، موبائل: 94707 38111

# اهم خبریں

## حضرت اشرف العلما علیہ الرحمہ کا آٹھواں سالانہ عرس کا انعقاد

حضرت اشرف العلما علامہ سید حامد اشرف علیہ الرحمہ کا آٹھواں سالانہ عرس مقدس مہاراشٹر کی سرزمین پر نہایت تزک واحتشام اور شان وشوکت کے ساتھ منایا گیا جو 10/ جنوری سے شروع ہوکر پندرہ دنوں تک جاری رہا۔ واضح ہو کہ اس مرتبہ کھڑک، دھاراوی، گھڑپ دیو، گھاٹ کوپر، ممبرا سے بھیونڈی تک پورے شہر میں اشرف العلما کے اس عرس مقدس کی دھوم رہی اور ہر جگہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں علماؤں عقیدتمندوں نے اپنے اس عظیم رہنما کو شریک اجلاس ہوکر خراجِ عقیدت وتحسین پیش کیا۔ مذکورہ جلسوں کی سرپرستی شہزادۂ وجانشین حضور اشرف العلما علامہ سید خالد اشرف نے فرمائی۔ شہزادۂ وجانشین حضور اشرف العلما علامہ سید نظام اشرف خطیب وامام زکریا مسجد کی قیادت میں متعدد جگہ اجلاس کو حضور غازی ملت حضرت علامہ سید محمد ہاشمی میاں صاحب، مولانا سید جلال الدین اشرف قادری میاں، مفسر قرآن مولانا ظہیر الدین خان، مولانا سید سلمان اشرف سجادہ نشین آستانہ عالیہ جائس شریف، مولانا حسیب اختر و دیگر علما نے خطاب فرمایا۔ متعدد اجلاس کی نظامت مولانا سید اطہر علی نے فرمائی۔ شہزادۂ حضور اشرف الاولیا مولانا سید جلال اشرف قادری میاں نے حضور اشرف العلما کی سیرت اوران کی دینی خدمات کو بالتفصیل سنایا۔ آپ نے دارالعلوم محمدیہ (مینارہ مسجد، ممبئی) کے فروغ میں شہزادگان حضور اشرف العلما کے تعاون پر زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ آپ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر نہایت ولولہ انگیز خطاب کیا آپ نے لوگوں کو خود احتسابی اور بارگاہ رب کریم میں استغفار کرتے رہنے کی تلقین کی۔ اپنی تقریر میں حضور غازی ملت نے عوام کو خصوصی سنیوں میں اتحاد اور حضور اشرف العلما کے علمی مشن کو آگے بڑھانے اور اُسے ترقی دینے اور بزرگان دین کی پاک زندگیوں کو نمونہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے اور سچے پکے مسلمان بننے اور دین وسنیت پر عمل کرنے کی تلقین کی۔

اپنے ولولہ انگیز خطاب میں مولانا سید شاہ سلمان اشرف نے اشرف العلما کی دینی ملی سماجی خدمات کو بہت مؤثر اور مدلل انداز میں پیش فرمایا۔ آپ نے حضور اشرف العلما کی حیات طیبہ کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کی خاندانی شرافت وعظمت اخلاق کریمانہ اور تقویٰ وپرہیزگاری کے عنوان سے سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ سربراہ اعلیٰ اور سرپرست اجلاس مولانا سید خالد اشرف اور قائد ملت مولانا سید شاہ نظام اشرف کے منظوم کلام صلوٰۃ وسلام ودعاؤں پر مجلس برخاست ہوئی۔

مہمانان خصوصی کے طور پر شہزادۂ غازی ملت مولانا سید سبحانی میاں، سید محمد علی نقشبندی لکھنوی، سید محی الدین اشرف، سید محمد علی، سید صلاح الدین اشرف، سید سراج اشرف، سید نظام اشرف صالح پوری، سید معز اشرف، سید پیر زاہد اشرف، مولانا حسیب اختر کانپوری نیز دارالعلوم محمدیہ کے تمام اسٹاف جیسے مولانا توکل حسین حشمتی، مولانا جان محمد برکاتی، مفتی نعیم اختر، مولانا مجیب الرحمٰن، مولانا قاری نورالہدیٰ اشرفی، مولانا ریاض احمد، مولانا سید مسعود اشرف، مولانا احسان احمد، مولانا شرف الدین مصباحی، مولانا عبدالقدوس، قاری شوکت علی، قاری واجد علی، قاری اسلام، قاری صدیق، قاری جمشید، مولانا نورالاسلام اشرفی، ماسٹر مسعود، قاری رفیق احمد، مولانا اسد علی، محمد تحسین رضا کے علاوہ سیکڑوں علما وائمہ مساجد جیسے مفتی سلیم اختر، مولانا غلام مصطفیٰ، مفتی عبدالرحیم، مولانا عبدالجبار ماہر القادری، مولانا معین الحق، مفتی بلال احمد، مولانا خورشید جمال، مولانا عبدالحنان، مولانا انیس اشرفی، مولانا نوشاد، مولانا مشتاق احمد تیغی، مولانا اعجاز احمد، مولانا عبدالقیوم مصباحی، مولانا قمر سلطان پوری، مولانا قاری حیدر علی، مولانا عبدالحکیم، ڈاکٹر احمد شیخ، قاری عبدالرشید رحمانی، مولانا نبی رضا، مولانا مختار احمد، مولانا رجب علی، مولانا شاہد رضا، مولانا محبّ اللہ، مولانا حسن علی، مولانا امین، مولانا سید علی احمد نے اسٹیج پر جلوہ گر رہے۔

بیرونی ومقامی شعرائے اسلام مولانا تبسم عزیزی، مولانا نسیم حبیبی کلکتوی، مکرم کانپوری، مولوی صدام حسین، حافظ شمشاد عالم (متعلّم دارالعلوم محمدیہ) نے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضور اشرف العلما کے بارگاہ میں ہدیہ نعت و منقبت بالترتیب پیش کیں اور مذکورہ جلسوں میں سنی دارالعلوم محمدیہ کے طلبہ مولوی ڈاکٹر احمد شیخ (مہاراشٹر کالج ممبئی) مولوی عبداللہ، مولوی بلال احمد حضور اشرف العلما کی خدمات اوران کے کارہائے نمایاں کو بہترین انداز میں پیش کیا۔

مقربین بارگاہ حضور اشرف العلما جناب ساجد پٹھان، آصف بھائی، محمد حسین موتی والا، محمد حسین، مولانا علی اصغر اشرفی، زین العابدین، نور محمد بھائی، ظفر بھائی، سلیم بھائی (بینک والے)، اشرف بھائی، نثار بھائی، زاہد بھائی، ایوب بھائی، فقیر محمد، عبدالوہاب مرچنٹ، احمد بھائی، ذبیح اللہ وغیرہم نے ان سبھی پروگراموں کو کامیاب بنانے میں بھرپور تعاون کیا۔

مذکورہ پروگرام میں وزیر اوقاف صوبہ مہاراشٹر عالی جناب عارف نسیم خان ایم ایل اے جناب ابوعاصم اعظمی، ایم ایل اے امین پٹیل، امین پاریکھ، ودیگر سیکڑوں معززین نے شرکت فرمائی۔ (رپورٹ: مولانا تحسین رضا)

## عرس امامین احمدین مجدّدین

24 جنوری 2012 کو بعد نماز عشا اُردو پارک (مینا بازار) جامع مسجد نئی

دہلی میں عرس امامین احمدین مجددین (امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی ومجدد ملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری محدث بریلوی علیہما الرحمۃ والرضوان) منعقد ہوا جس کی سرپرستی وصدارت مفتی محمد میاں ثمر دہلوی (سجادہ نشین خانقاہ مسعودیہ مظہریہ ودرگاہ مظہریہ اندرون شاہی مسجد فتح پوری، دہلی) نے فرمائی۔ تلاوت قاری محمد نسیم قادری نیپال نے اور نعت پاک مولانا حجۃ الاسلام صاحب، مولانا محمد فروغ صاحب ومولانا رفعت رضا نوری مصباحی نے پیش کی۔ عرس میں خصوصی مقررین تھے مولانا صغیر احمد جوکھن پوری، مہتمم الجامعۃ القادریہ و فاطمۃ البنات رچھا بریلی شریف اور مولانا مفتی محمد فاروق نقشبندی مہتمم دارالعلوم جامعہ رضویہ اشرفیہ راجوری جموں کشمیر۔ نظامت کے فرائض مولانا فروغ احمد طریقی نائب امام مسجد شیخان بارہ ہندو راؤ دہلی نے انجام دیے۔

آخر میں بانی عرس مجددین وصدر اجلاس حضرت قاضی اہل سنت دہلی ومفتی اعظم صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ بریلویت کوئی مسلک یا فرقہ نہیں ہے۔ اہل سنت کا مسلک آفاقی ہے، ہم اہل سنت وجماعت ہیں۔ اُردو پارک جامع مسجد میں امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ واعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے سالانہ عرس کے موقع پر منعقد عرس مجددین کے دوران اپنے صدارتی خطاب میں مفتی محمد میاں ثمر دہلوی نے کہا کہ بریلویت کو اس انداز میں سمجھنا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے بریلی کی سرزمین پر ایک جلیل القدر اہل سنت کا عالم پیدا فرمایا اور دین میں جو رخنے پڑ گئے تھے ان سے دین کو کھنگال کر صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ جب تک روئے زمین پر اہل سنت ہیں اس وقت تک اپنے اس محسن یعنی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ زمانہ ہزار سالہ مجدد کے روحانی تصوف سے خالی نہیں ہوتا اور اگر بادشاہ وقت بھی غلط روش پر آجائے تو ہزار سالہ مجدد اس کی پرواہ کیے بغیر معاشرہ کی اصلاح اپنی قوتِ باطنی کے ذریعہ کر کے دین کو از سر نو تازہ کر دیتا ہے۔ یہی کارنامہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ نے انجام دیا۔ صلوٰۃ وسلام کے بعد قاضی اہل سنت کی دعا پر پروگرام 2 بجے شب اختتام پذیر ہوا۔ عرس میں کثیر تعداد میں علما وشعرا اور سامعین نے شرکت کی۔

## دھاراوی ممبئی میں جشن میلاد النبی کا انعقاد

12 فروری کو بعد نماز مغرب جامع مسجد چھڑا بازار کمپاؤنڈ دھاراوی ممبئی میں ایک عظیم الشان جشن میلاد النبی منایا گیا جس میں نوجوان علمائے کرام نے اپنے پرمغز اور اصلاحی بیانات سے سامعین کی ایک کثیر تعداد کو دین سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ جامعہ عارفیہ الہ آباد سے تشریف لائے مولانا کتاب الدین رضوی نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ انسانوں کو جہاں جسم کی راحت کے سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہیں روح کے سامان کی بھی ضرورت ہوتی ہے دونوں کے بغیر زندگی صحیح ڈھنگ سے نہیں گزاری جا سکتی۔ افسوس ہے کہ آج کا انسان اپنے جسم کے لیے خوب خوب سامان تیار کرتا ہے اور اپنی ساری زندگی اسی کے حصول میں لگا دیتا ہے مگر اپنی روح کے تقاضوں سے یکسر غافل رہتا ہے حالانکہ اس کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر کامیابی نہیں مل سکتی۔

جامعہ عارفیہ الہ آباد کے ہی استاذ مولانا عارف اقبال مصباحی نے اپنے پرمغز خطاب میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے قرآن کریم کی ایک آیت کے حوالے سے فرمایا کہ قرآن کریم میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پانچ خصوصیات یعنی شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ اور سراج منیر بیان کی گئی ہیں تو جس کے اندر بھی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ پانچ صفات پائی جائیں گی وہ یقیناً نبی کریم کا صحیح معنوں میں وارث ونائب ہوگا۔ اس آیت کے مختلف گوشوں پر مولانا موصوف نے روشنی ڈالتے ہوئے سامعین کو غور وفکر کی دعوت دی۔ اس جشن کی سرپرستی خانقاہ عارفیہ سید سراواں الہ آباد کے سجادہ نشین داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ چشتی صفوی نے فرمائی اور انہیں کی دعا پر یہ جشن رات تقریباً گیارہ بجے اختتام پذیر ہوگیا۔ حضرت موصوف کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد تین سو سے متجاوز ہے۔ آپ ہی کی سرپرستی میں تصوف پر علمی وتحقیقی سالنامہ 'الاحسان' الہ آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ نظامت کے فرائض حافظ سرفراز عارفی خطیب وامام جامع مسجد دھاراوی نے انجام دیے۔ (رپورٹ: صادق رضا مصباحی)

## کوٹہ میں عرس مفتی ملت علیہ الرحمہ

راجستھان کا مرکزی ادارہ دارالعلوم رضائے مصطفےٰ وگیان نگر کوٹہ کا سالانہ سولہواں جلسہ دستارِ فضیلت اور بانی ادارہ حضرت الحاج مفتی محمد اختر حسین مصباحی علیہ الرحمہ والرضوان کا گیارہواں عرس مفتی ملت 11 صفر المظفر 1433ھ بروز جمعرات منعقد ہوا، جس کی صدارت شہزادۂ حضرت مفتی ملت مفتی محمد شمیم اشرف رضوی مہتمم دارالعلوم ہٰذا نے فرمائی۔ سرپرستی حضرت صوفی الحاج قاری عبدالرحمٰن خلیفہ حضرت مفتی اعظم ہند بریلی شریف نے کی۔ مقرر خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا قاری روح الامین صاحب نے ''اسلام کا تعارف میڈیکل سائنس کے حوالے سے'' بڑے ہی اچھوتے انداز میں کرایا اور مولانا محمد شبیر عالم بھدوی نے علم کی اہمیت پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ مداحِ رسول انصار اللہ فیضی اور شاعر اسلام محمد مستقیم رضا نے نعت ومنقبت پیش کی۔ بعدہ جلسہ صلوٰۃ وسلام پر اختتام پذیر ہوا۔ (رپورٹ: شہباز احمد مصباحی، مدرس دارالعلوم ہٰذا)